اہل سنت کون؟

حافظ ابو یحییٰ نور پوری

امام عبداللہ بن زبیر القرشی الاسدی المکی ابوبکر الحمیدی رحمہ اللہ (م ۲۱۹ھ) فرماتے ہیں:

''ہمارے (اہل سنت محدثین کے) ہاں سنت یہ ہے کہ آدمی اچھی و بری اور میٹھی وکڑوی تقدیر پر ایمان لائے، یہ یقین کرلے کہ جو کچھ اسے (تقدیر میں) ملنے والا ہے، وہ اس سے چوک نہیں سکتا اور جو کچھ اس سے (تقدیر میں) چوکنے والا ہے، وہ اسے مل نہیں سکتا، سب کچھ تقدیرِ الٰہی سے ہوتا ہے، ایمان قول اور عمل کا نام ہے، اس میں کمی وبیشی ہوتی رہتی ہے، عمل کے بغیر قول فائدہ مند نہیں ہوتا، نیت کے بغیر قول وعمل دونوں مفید نہیں ہوتے اور سنتِ (نبوی) کے بغیر نیت اور قول وعمل تینوں بے فائدہ ہیں، تمام صحابہ کرام کے لیے رحمت کی دعا کرنا (بھی سنت ہے)، کیونکہ اللہ عزوجل کا فرمان ہے: ﴿وَالَّذِیْنَ جَآءُ وا مِنْ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّکَ رَءُ وْفٌ رَّحِیْمٌ﴾ (الحشر: ۱۰) (اور وہ لوگ جوان صحابہ کرام کے بعد آئیں وہ کہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اور ان لوگوں کو معاف فرمادے جو ہم سے پہلے ایمان لائے تھے، ہمارے دلوں میں ان کے خلاف کینہ پیدا نہ کرنا، اے ہمارے رب! یقیناً تو بے حد مہربان اور نہایت رحیم ہے)، ہمیں صرف ان کے لیے استغفار کا حکم دیا گیا ہے، لہٰذا جوان سب کو، بعض کو یا ان میں سے کسی ایک کو برا بھلا کہے گا، وہ سنت پر نہیں ہوگا، نہ ہی اس کے لیے مالِ فے میں سے کوئی حصہ ہوگا، یہ بات ہمیں کئی ایک اساتذہ نے امام مالک رحمہ اللہ سے بیان کی ہے، انہوں نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے مالِ فے کی تقسیم کرتے ہوئے مذکورہ فرمان جاری کیا ہے، اس لیے جو شخص صحابہ کے بارے میں ایسا (استغفار والا قول) نہیں کہے گا، وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہوگا، جن کو اللہ تعالیٰ نے مالِ فے میں حصہ دیا ہے، (سنت یہ ہے کہ) قرآن اللہ تعالیٰ کی کلام ہے، میں نے امام سفیان کو یہ فرماتے ہوئے سنا، قرآن اللہ تعالیٰ کی کلام ہے، جو اسے مخلوق کہے، وہ بدعتی ہے، ہم نے (سلف صالحین میں سے) کسی کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا، نیز میں نے امام سفیان (بن عیینہ) رحمہ اللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ایمان قول اور عمل کا نام ہے، یہ بڑھتا بھی ہے اور کم بھی ہوتا ہے، ان کے بھائی ابراہیم بن عیینہ نے کہا، اے ابو محمد! تو اس طرح نہ کہہ کہ کم ہوتا ہے، امام صاحب غصے میں آگئے اور فرمانے لگے، بچے! خاموش ہوجا، کیوں نہیں (ایمان میں کمی وبیشی یقیناً ہوتی ہے)، حتی کہ بسا اوقات اس میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہتا، اسی طرح موت کے بعد رؤیتِ باری تعالیٰ اور دیگر صفاتِ الٰہی جو قرآن وسنت نے بتائی ہیں، ان کا اقرار (بھی سنت ہے)، جیسا کہ صفتِ 'ید' اور صفتِ 'یمین' وغیرہ ہیں، ایک مسلمان ان صفات کو بیان کرنے میں کوئی بات بھی (اپنی طرف سے) زائد نہیں کرے گا اور نہ ہی ان کی تفسیر کرے گا، بلکہ جہاں قرآن و سنت نے توقف کیا ہے، وہاں وہ بھی توقف کرے گا، وہ کہے گا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے، جو آدمی اس عقیدے کے خلاف کوئی بھی عقیدہ رکھے گا، وہ جہمی اور معطّل (صفاتِ باری تعالیٰ کا انکاری) ہوگا، نیز (اہل سنت کہلانے والا) خارجیوں کی طرح یہ بھی نہیں کہے گا کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب کافر ہوجاتا ہے، بلکہ کسی گناہ کی وجہ سے مسلمان کو کافر نہیں کہا جائے گا، کفر تو صرف ان پانچ چیزوں کے ترک کا نام ہے جن پر اسلام کی بنیاد ہے، یعنی توحید ورسالت کی گواہی، نماز کا قیام، زکوٰۃ کی ادائیگی، رمضان کے روزے اور بیت اللہ کا حج، ان پانچوں چیزوں میں سے تین چیزوں یعنی توحید ورسالت کی گواہی، نماز اور زکوٰۃ کے تارک کو مہلت نہیں دی جائے گی، کیونکہ ان میں سے کوئی چیز اپنے وقت سے مؤخر نہیں ہوسکتی اور نہ ہی جان بوجھ کر اسے لیٹ کرنے والے کی قضاء کام دے گی، رہ گئی زکوٰۃ تو جب بھی مسلمان اسے ادا کرے ادا ہوجائے گی، البتہ دیر کرنے پر وہ گنہ گار ہوجائے گا اور رہا حج تو جس آدمی کے پاس استطاعت آجائے اور حج واجب ہوچکا ہو تو وہ اسی سال ضروری نہ ہوگا، بلکہ جب بھی ادا کرے گا، ادا ہوجائے گا، لیٹ کرنے کی وجہ سے وہ گنہ گار نہ ہوگا، بخلاف زکوٰۃ کے کہ اس میں گنہ گار ہوگا، کیونکہ یہ مسکین مسلمانوں کا حق ہے جسے اس نے روک رکھا ہے، لہٰذا ان تک پہنچنے تک وہ گنہ گار ہوگا، جبکہ حج کا معاملہ بندے اور اللہ کے درمیان ہے، جب وہ اسے ادا کرے گا، ادا ہوجائے گا، اور اگر وہ صاحبِ حیثیت واستطاعت ہونے کی حالت میں بغیر حج کیے فوت ہو جائے تو وہ حج کرنے کے لیے دنیا کی طرف لوٹائے جانے کا مطالبہ کرے گا، ایسے شخص کی طرف سے اس کے اہل وعیال پر حج کرنا فرض ہے، ہم امید کرتے ہیں کہ یوں میت کی طرف سے حج ادا ہوجائے گا، جیسا کہ میت کی طرف سے قرض ادا کردیا جائے تو وہ ادا ہوجاتا ہے۔ (مسند الحمیدی: ۲/۵۴۶۔۵۴۸)

❁❁❁❁❁❁❁

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین

ماہنامہ جہلم

السنۃ

دار التخصص والتحقیق، جہلم، پاکستان

جلد نمبر ۱ | شعبان ۱۴۳۰ھ، اگست ۲۰۰۹ء | شمارہ نمبر: ۱۰

مدیر

غلام مصطفٰی ظہیر امن پوری

0300-5482125

نائب مدیر

حافظ ابو یحیٰی نور پوری

ایم۔اے

Ejazsaqi@walla.com

0301-6808274

قیمت	فی شمارہ 20 روپے	سالانہ: 200 روپے علاوہ محصول ڈاک	پاکستان مع محصول ڈاک 250 روپے

اس شمارے میں

خط کتابت

شوکت نصیب خان

ریلوے ہسپتال روڈ، مشین محلہ نمبر ۲

جہلم، پاکستان

مقام اشاعت

دار التخصص والتحقیق

جہلم، پاکستان

ناشر

محمد اشرف الحنفی

0300-5133346

قرآن و حدیث دونوں کا وحی اور اصولِ دین ہونا مسلمانوں کا اجماعی و اتفاقی عقیدہ ہے، ہر قسم کے تنازع اور اختلاف کو ان کی طرف لوٹانے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، معلوم ہوا کہ قرآن و حدیث دونوں اللہ کی طرف سے ہیں اور حق ہیں اور اللہ تعالیٰ کی حفاظت کے ساتھ محفوظ و معصوم ہیں، ورنہ ان کی طرف تنازع اور اختلاف لوٹانے کا کیا معنیٰ؟ نیز ثابت ہوا کہ شرعی نصوص آپس میں متفق و متحد ہیں، حقیقت میں ان کے مابین کوئی تعارض نہیں، ورنہ اختلاف کے وقت ان کی طرف رجوع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

امام ابن ابی العز الحنفی رحمہ اللہ (۷۹۲ھ) لکھتے ہیں: **والأمور الّتی تنازع فیها الأمّة فی الأصول والفروع اذا لم تردّ الی اللّٰه والرّسول لم یتبیّن فیها الحقّ، بل یصیر فیها المتنازعون علی غیر بیّنة من أمرهم ....** ”جن اصول و فروع امور میں امت نے اختلاف کیا ہے، جب ان کو اللہ و رسول کی طرف نہ لوٹایا جائے، حق واضح نہیں ہوتا، بلکہ اختلاف کرنے والے اپنے معاملے پر بغیر دلیل کے رہ جاتے ہیں۔“ (شرح العقیدة الطحاویة: ص ۵۱۵)

قرآن وحی ہے، حدیث بھی وحی ہے، قرآن محفوظ ہے، حدیث بھی اللہ تعالیٰ کی حفاظت سے محفوظ ہے، قرآن حق ہے، حدیث بھی حق ہے، قرآن نور ہے، حدیث بھی نور ہے، قرآن ہدایت ہے، حدیث بھی ہدایت ہے، قرآن فرقان ہے، حدیث بھی فرقان ہے، جس طرح قرآن کی تصدیق ضروری ہے، اسی طرح حدیث کی تصدیق بھی ضروری ہے، جس طرح قرآن پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح حدیث پر ایمان لانا بھی ضروری ہے، جس طرح قرآن پر عمل ضروری ہے، اسی طرح حدیث پر بھی عمل کرنا بھی ضروری ہے، دونوں کے اللہ کا دین اور اس کا علم ہونے میں کوئی شک نہیں، اسی لیے اختلاف کے وقت ان کی طرف رجوع ضروری ہے، یہی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان کی دلیل ہے، یہ ایمان کے موجبات اور لوازم میں ہے، بلکہ ایمان کی صحت کے لیے شرط ہے اس کے بغیر امت کے اتحاد و اتفاق کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا، ضلالت و جہالت اور بدعتیوں کے طور طریقوں سے بچنے اور تلاشِ حق کا یہی واحد راستہ ہے، درحقیقت یہ حق کی پیروی ہے۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴾

''پس اگر تم کسی چیز کے بارے تنازع میں پڑ جاؤ تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو، یہ بہتر اور خوب ترین تعمیل ہے۔''

علامہ شاطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **وهذه صريحة فى رفع التّنازع والاختلاف ، أى عن الشّريعة ، فانّه ردّ المتنازعين الى الشّريعة ، وليس ذلك الّا ليرتفع الاختلاف ، ولا يرتفع الاختلاف الّا بالرّجوع الى شيء واحد ، اذ لو كان فيه ما يقتضى الاختلاف لم يكن فى الرّجوع اليه رفع تنازع ، وهذا باطل ...**

''یہ آیت شریعت میں تنازع واختلاف نہ ہونے پر واضح دلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اختلاف کرنے والوں کو شریعت کی طرف لوٹنے کا حکم فرمایا ہے اور یہ اسی لیے ہے کہ اختلاف ختم ہو جائے ،اختلاف تو تب ہی ختم ہوگا جب کسی ایک ہی چیز کی طرف رجوع کیا جائے ، کیونکہ اگر اسی چیز میں ہی اختلاف والی کوئی بات ہوئی تو پھر اس کی طرف رجوع سے اختلاف ختم نہ ہوگا اور یہ باطل بات ہے۔''

(الموافقات للشاطبی : ۱۱۹/٤، الاعتصام للشاطبی : ۳۰۹/۲۔۳۱۰)

حافظ ابن قیّم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **ولو لم يكن فى كتاب اللّٰه وسنّة رسوله بيان حكم ما تنازعوا فيه ، ولم يكن كافيا لم يأمر بالردّ اليه ، اذ من الممتنع أن يأمر تعالىٰ بالرّدّ عند النّزاع الى من لا يوجد عنده فصل النّزاع ...** ''اگر کتاب اللہ اور سنتِ رسول میں لوگوں کے اختلاف کا حل نہ ہوتا اور یہ چیز کافی نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف رجوع کا حکم نہ فرماتے ، کیونکہ یہ بات ممتنع ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی چیز کی طرف رجوع کا حکم فرمائے جس میں اختلاف کا حل موجود نہ ہو۔'' (اعلام الموقعین : ٤٩/١)

امام میمون بن مہران تابعی رحمہ اللہ (۴۰۔۱۱۷ھ) فرماتے ہیں: **الرّدّ الى اللّٰه الرّدّ الى كتابه ، والرّدّ الى الرّسول اذا كان حيّا ، فلمّا قبضه اللّٰه فالرّدّ الى سنّته ...**

''اللہ کی طرف لوٹنے سے مراد اس کی کتاب کی طرف لوٹنا ہے اور جب رسولِ کریم ﷺ زندہ تھے اس وقت ان کی ذات کی طرف لوٹنا تھا اور جب آپ فوت ہو گئے تو اب آپ کی سنت کی طرف رجوع کرنا ہے۔''

(تفسیر طبری : ۹٦/٥ ، مشکل الآثار للطحاوی : ٤٧٤/١، الفقیه للخطیب : ١٤٤/١، وسنده حسن)

امام عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ (م۱۱۴ھ) اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: **الى اللّٰه : الى كتاب اللّٰه جلّ وعلا ، والى الرّسول : الى سنّة رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم .**

’’اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے سے مراد اللہ تعالیٰ کی کتاب کی طرف رجوع کرنا ہے اور رسول کی طرف رجوع سے مراد رسول اللہ ﷺ کی سنت کی طرف رجوع ہے۔‘‘(الشريعة للآجري : ٥٨، وسندہٗ حسن)

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: انّ النّاس أجمعوا أنّ الرّدّ الی اللّٰه سبحانه هو الرّدّ الی کتابه ، والرّدّ الی الرّسول صلی الله علیه وسلم هو الرّدّ الیه نفسه فی حیاته والی سنّته بعد وفاته .

’’لوگوں نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف اختلاف لوٹانے کا مطلب اس کی کتاب کی طرف اختلاف لوٹانا ہے اور رسولِ کریم ﷺ کی طرف اختلاف لوٹانے کا معنیٰ ومفہوم آپ کی زندگی میں آپ کی ذاتِ بابرکات کی طرف اور آپ کی وفات کے بعد آپ کی سنت کی طرف اختلاف کو لوٹانا ہے۔‘‘(اعلام الموقعين : ٤٩/١)

علامہ شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: فقد اتّفق المسلمون سلفهم وخلفهم من عصر الصّحابة الی عصرنا هذا أنّ الواجب عند الاختلاف فی أیّ أمر من أمور الدّین بین الأئمّة المجتهدین ، هو الرّدّ الی کتاب اللّٰه سبحانه ، وسنّة رسوله صلی الله علیه وسلم ، النّاطق بذلک الکتاب العزیز : ﴿ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ﴾(النساء : ٥٩)ومعنیٰ الرّدّ الی اللّٰه سبحانه : الرّدّ الیٰ کتابه ، ومعنیٰ الرّدّ الی الرّسول صلی الله علیه سلم الرّدّ الی سنّته بعد وفاته ، وهذا ممّا لا خلاف فیه بین جمیع المسلمین . ’’صحابہ کرام کے دور سے لے کر آج تک کے مسلمان سلف وخلف کا اجماع ہے کہ امورِ دین میں سے کسی بھی امر میں مجتہدین کے درمیان اختلاف کی صورت میں ضروری کام کتاب اللہ اور سنتِ رسول کی طرف رجوع کرنا ہے، قرآنِ کریم نے اسے یوں بیان کیا ہے: (پھر اگر تم کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاؤ)، اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹانے کا مطلب اس کی کتاب کی طرف لوٹانا ہے، جبکہ اس کے رسول کی طرف لوٹانے کا معنیٰ آپ کی وفات کے بعد آپ کی سنت کی طرف لوٹانا ہے، یہ ایسی باتوں میں سے ہے جن میں تمام مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہیں۔‘‘(شرح الصدور بتحريم رفع القبور : ص١)

حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ (۷۰۱۔۷۷۴ھ) لکھتے ہیں: وهذا أمر من اللّٰه عزّ وجلّ بأنّ کلّ شیء تنازع النّاس فیه من أصول الدّین وفروعه ، أن یردّ التّنازع فی ذلک الی الکتاب والسّنة ، کما قال تعالیٰ : ﴿ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْهِ مِنْ شَیْءٍ فَحُكْمُهٗ اِلَی اللّٰهِ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّیْ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَیْهِ اُنِیْبُ ﴾، فما حکم به الکتاب والسّنّة ، وشهدا له بالصّحة ، فهو الحقّ ، وما ذا بعد الحقّ الّا الضّلال ، ولهذا قال تعالیٰ : ﴿ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ ، أی ردّو الخصومات

والجهالات الى كتاب اللّٰه وسنّة رسوله ، فتحاكموا اليهما فيما شجر بينكم : ﴿ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ ، فدلّ على أنّ من لم يتحاكم فى محلّ النّزاع الى الكتاب والسّنّة ، ولا يرجع اليهما فى ذلک ، فليس مؤمنا باللّٰه ولا باليوم الآخر ، وقوله : ﴿ ذٰلِکَ خَيْرٌ ﴾ أى التّحاكم الى كتاب اللّٰه وسنّة رسوله ، والرّسول اليهما فى فصل النّزاع خير : ﴿ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴾ أى وأحسن عاقبة ومآلاً . ''یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہے کہ دین کے اصول وفروع میں سے ہر وہ چیز جس میں لوگوں کا اختلاف ہو اس اختلاف کو کتاب وسنت کی طرف لوٹایا جائے ، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (اور جس چیز میں تم اختلاف کرو، اس کا فیصلہ اللہ ہی کی طرف لوٹاؤ)، جو فیصلہ کتاب وسنت کریں اور جس کے صحیح ہونے کی وہ گواہی دیں، وہ حق ہے اور حق کے علاوہ صرف گمراہی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (اگر تم اللہ و یومِ آخرت پر ایمان لاتے ہو تو۔۔۔) یعنی اپنے اختلافات اور اپنی لاعلمی کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول کی طرف لوٹاؤ اور جس بارے تمہارے درمیان جھگڑا ہو اسے انہی دونوں کی طرف لے کر آؤ، اگر تم اللہ و یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے اختلاف میں کتاب وسنت کی طرف فیصلہ لے کر نہ آئے اور رجوع نہ کرے وہ اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، نیز فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿ ذٰلِکَ خَيْرٌ ﴾ کا مطلب ہے کہ اختلاف کے فیصلے کے لیے قرآن وسنت کی طرف رجوع بہتر ہے ﴿وَاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴾ یعنی یہ کام عاقبت اور انجام کے لحاظ سے بہترین ہے۔'' (تفسير ابن كثير : ٣١٣/٢ بتحقيق عبد الرزاق مهدى)

نیز اللہ رب العزت کا فرمان ہے: ﴿وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ اِلَى اللّٰهِ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيبُ ﴾ (الشورىٰ : ١٠)

''اور جس چیز میں بھی تم اختلاف کرو، اس کا فیصلہ اللہ کی طرف (لے کر آؤ)۔''

آیتِ کریمہ میں اختلاف کو اللہ کی طرف لوٹانے کا حکم دیا گیا ہے، قرآن وحدیث دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، اللہ تعالیٰ نے رسولِ کریم ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور آپ ﷺ کے فیصلوں کو قبول نہ کرنے پر وعید بھی سنائی ہے، مزید اس آیت کی تفسیر سورۂ نساء کی آیت نمبر ۵۹ نے کر دی ہے، اسی لیے حافظ ابنِ کثیر ؒ لکھتے ہیں: مهما اختلفتم فيه من الأمور ، وهذا عامّ فى جميع الأشياء ﴿فَحُكْمُهُ اِلَى اللّٰهِ﴾ أى هو الحاكم فيه بكتابه وسنّة نبيّه صلى الله عليه وسلم ، كقوله جلّ وعلا: ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ﴾ (النساء : ٥٩)

''جس چیز میں بھی تم اختلاف کرو، یہ تمام چیزوں میں عام حکم ہے کہ اس کا فیصلہ اللہ کی طرف لوٹایا جائے، یعنی اللہ اپنی کتاب اور اپنے نبی ﷺ کی سنت کے ذریعے اس میں فیصلہ کرے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ﴾(النساء: ۵۹) (پس اگر تم کسی چیز میں اختلاف کرو تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو)۔''(تفسیر ابن کثیر: ۴۹۳/۵)

تنبیہ : اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَاِذَا جَآءَ هُمۡ اَمۡرٌ مِّنَ الۡاَمۡنِ اَوِ الۡخَوۡفِ اَذَاعُوۡا بِهٖ وَلَوۡ رَدُّوۡهُ اِلَی الرَّسُوۡلِ وَ اِلٰۤی اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡهُمۡ لَعَلِمَهُ الَّذِیۡنَ یَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ مِنۡهُمۡ﴾(النساء: ۸۳)

''اور جب ان کے پاس امن یا خوف کا کوئی امر آتا ہے تو وہ اس کو پھیلا دیتے ہیں اور اگر وہ اس کو رسول اور اولی الامر کی طرف لوٹاتے تو اسے ان میں سے اہل تحقیق جان لیتے۔''

اگر یہ کہا جائے کہ پہلے یہ ذکر گزرا ہے کہ اختلاف کو صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف لوٹانا ہے، جبکہ اس آیتِ کریمہ میں رسول اور اولی الامر کی طرف لوٹانے کا ذکر ہے، قرآنِ مجید میں یہ تعارض و اشکال کیسے دور ہوگا؟

جواب نمبر①: اس آیتِ کریمہ میں تنازع اور اختلاف کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کو بیان کیا جا رہا ہے کہ فتح یا شکست کی خبریں بغیر تحقیق آگے پھیلانے کے بجائے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں آپ تک پہنچا دو، آپ کی وفات کے بعد اہل علم و تحقیق مسلمان حکمرانوں اور مسلمان سپہ سالاروں کے سامنے پیش کریں کہ یہ خبر صحیح ہے یا غلط، اس کو نشر کرنا مفید ہے یا اسلام اور اہل اسلام کی مصلحت کی خاطر چھپانا واجب ہے، اس لیے حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **وفی هذه الآیة انکار علی من یبادر الی الأمور قبل تحقیقها ، فیخبر بها ویفشیها ، وینشرها ، وقد لا یکون لها صحّة .**

''اس آیتِ کریمہ میں اس شخص پر انکار ہے جو تحقیق سے پہلے ہی جلدی سے امور کی خبر دیتا ہے اور ان کو پھیلاتا ہے، جبکہ بسا اوقات وہ امور صحیح ثابت نہیں ہوتے۔''(تفسیر ابن کثیر: ۳۳۲/۲)

② نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: **کفیٰ بالمرء کذبا أن یحدّث بکلّ ما سمع .**

''آدمی کی (تباہی کے لیے) یہی گناہ کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو (بغیر تحقیق کے آگے) بیان کر دے۔''(مقدمہ صحیح مسلم: ۵، سنن ابی داؤد: ۴۹۹۲، وسندہٗ صحیح وصححہ ابن حبان: ۳۰)

لہٰذا آیات کے درمیان ظاہری تعارض دور ہوا، اس تعارضِ قرآنی کو دور کرنے میں حدیث مددگار ثابت ہوئی ہے۔

وسیلہ کی تین قسمیں ہیں، ان میں سے دو مشروع و جائز ہیں اور تیسری غیر مشروع و ناجائز ہے، وسیلہ کی ایک مشروع اور جائز قسم یہ ہے کہ انسان اپنے نیک اعمال کا وسیلہ پیش کرے، جیسا کہ تین آدمیوں کا غار کے پتھر والا واقعہ مشہور ہے، جنہوں نے اپنے اپنے نیک اعمال کا وسیلہ پیش کیا تھا، ان کی پریشانی رفع ہوگئی تھی۔
(صحیح بخاری : ۸۸۳/۲ ، ح : ۵۹۷٤، صحیح مسلم : ۳۵۳/۲ ، ح : ۲۷٤۳)

وسیلہ کی دوسری مشروع صورت یہ ہے کہ کسی صالح اور موحد انسان سے دعا کرائی جائے، جیسا کہ سورۂ نساء (٦٤) میں اس کا ثبوت مذکور ہے، ایک نابینا شخص نے نبی کریم ﷺ سے دعا کروائی تھی۔ (سنن ترمذی : ۳۵۷۸ ، وسندہٗ حسن) اور سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے چچا عباس بن عبدالمطلب سے دعا کروائی تھی۔ (صحیح بخاری : ۱۳۷/۱ ، ح : ۱۰۱۰)

وسیلہ کی غیر مشروع اور ناجائز صورت یہ ہے کہ حاضر یا غائب، زندہ یا فوت شدہ کی ذات کا وسیلہ پیش کیا جائے یا صاحبِ قبر کو یہ کہا جائے کہ آپ میرے حق میں دعا اور سفارش کریں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں یا آپ کی وفات کے بعد آپ کی ذات کا وسیلہ پیش نہیں کیا، سلف صالحین اور ائمہ محدثین سے بھی یہ قطعاً ثابت نہیں ہے۔

پهلی وجه : وسیلہ کی اس صورت کے غیر مشروع اور ناجائز وممنوع ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ بدعت ہے، قرآن وحدیث میں اس کا ثبوت نہیں، صحابہ کرام اور سلف صالحین کا اس پر عمل نہیں، نبی اکرم ﷺ کا فرمانِ گرامی ہے: **من عمل عملا ، ليس عليه أمرنا ، فهو ردّ .**

''جو آدمی کوئی ایسا کام کرے جس پر ہمارا امر نہ ہو، وہ مردود ہے۔'' (صحیح مسلم : ۷۷/۲ ، ۱۸/۱۷۱۸)

قال الامام اسحاق بن راهويه ، أخبرنا يونس ، نا ابن جريج عن عطاء ، قال : سمعت ابن عبّاس يقول : عجبا لترک النّاس هذا الاهلال ولتكبيرهم ما بى ، الّا أن يكون التّكبيرة حسنا ، ولكنّ الشّيطان يأتى الانسان من قبل الاثم ، فاذا عصم منه جاء ه من نحو البرّ ليد ع سنّة ، وليبتدع بدعة . ''سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، لوگوں کے اس تلبیہ اور تکبیر کے چھوڑ دینے پر تعجب

ہے، میرے نزدیک تکبیر اچھی چیز ہے، لیکن شیطان انسان کے پاس گناہ کے دروازے سے آتا ہے، جب وہ اس سے بچ جائے تو وہ اس کے پاس نیکی کے دروازے سے آتا ہے، تاکہ وہ سنت کو چھوڑ کر بدعت کو اپنا لے۔''

(مسند اسحاق بن راھویہ : ٤٨٢، وسندهٔ صحیح)

امام ابنِ جریج رحمہ اللہ کہتے ہیں: **عطاء ، فأنا سمعته منه ، وان لم أقل سمعت .**

''میں نے امام عطاء بن ابی رباح سے سنا ہوتا ہے، اگرچہ میں سننے کی صراحت نہ بھی کروں۔''

(تاریخ ابن ابی خیثمة : ٢٤١/٢، ٢٤٧، وسندهٔ صحیح)

لہٰذا ثابت ہوا کہ امام ابنِ جریج کی امام عطاء بن ابی رباح سے ''عن'' والی روایت بھی سماع پر محمول ہوگی۔

دوسری وجہ : اس وسیلہ کے غیر مشروع اور ناجائز ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ دین میں غلوّ ہے، نبی کریم ﷺ کا فرمانِ گرامی ہے: **وایّاکم والغلوّ فی الدّین ، فانّما أھلک من کان قبلکم الغلوّ فی الدّین .** ''تم دین میں غلو سے بچو، تم سے پہلے لوگوں کو دین میں غلو نے ہی ہلاک کر دیا تھا''(مسند الامام احمد : ٢١٥/١ ، سنن نسائی : ٣٠٥٩ ، سنن ابن ماجه : ٣٠٢٩ ، مسند ابی یعلیٰ : ٢٤٢٧ ، المستدرك للحاكم : ٤٦٦/١ ، وسندهٔ صحیح)

اس حدیث کو امام ابن الجارود (٤٧٣)، امام ابنِ خزیمہ (٢٨٦٧)، امام ابنِ حبان (٣٨٧١) نے ''صحیح'' اور امام حاکم رحمہ اللہ نے اس کو امام بخاری اور امام مسلم کی شرط پر ''صحیح'' کہا ہے، حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔

ہر بدعت کا منشاء دین میں غلو ہے، دین میں غلو ہلاکت و بربادی کا موجب ہے۔

تیسری وجہ : سلف صالحین راہِ اعتدال پر تھے، سنت کے متبع تھے، وسیلہ کی اس قسم کا ان کی زندگیوں میں ثبوت نہیں ملتا، سلف صالحین کی پیروی اہل سنت والجماعت کا شعار ہے، ان کی مخالفت اہل بدعت کا شیوہ ہے، شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ثمّ سلف الأمّة وأئمّتها وعلمائھم الی ھذا التّاریخ ، سلکوا سبیل الصّحابة فی التّوسّل فی الاستسقاء بالأحیاء الصّالحین الحاضرین ، ولم یذکر أحد منھم فی ذلک التّوسّل بالأموات ، لا من الرّسل ، ولا من الأنبیاء ، ولا من الصّالحین . ''پھر امت کے اسلاف وائمہ اور علمائے کرام آج کے دن تک بارش طلب کرنے کے حوالے سے نیک زندہ لوگوں کا وسیلہ لینے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریقے پر چلے ہیں، ان میں سے کسی ایک سے بھی یہ منقول نہیں کہ انہوں نے مردوں کا وسیلہ پیش کیا ہو، نہ

رسولوں کا، نہ انبیاء کا اور نہ عام نیک لوگوں کا۔'' (الرد علی البکری لابن تیمیة : ص ١٢٦۔١٢٧)

شارحِ ترمذی امام محمد عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **قلت : الحق عندی أنّ التوسّل بالنّبیّ صلی الله علیه وسلم فی حیاته بمعنی التّوسّل بدعائه وشفاعته جائز ، وکذا التّوسّل بغیره من أهل الخیر والصّلاح فی حیاتهم بمعنی التّوسّل بدعائهم وشفاعتهم أیضا جائز ، وأمّا التّوسّل به صلی الله علیه وسلم بعد مماته ، وکذا التّوسّل بغیره من أهل الخیر والصّلاح بعد مماتهم ، فلا یجوز واختاره الامام ابن تیمیة . . .**

''میرے نزدیک حق بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی زندگی میں آپ کے وسیلہ سے مراد آپ کی دعا اور سفارش والا وسیلہ ہے جو کہ جائز ہے، اسی طرح نیک لوگوں سے ان کی زندگی میں ان کی دعا اور سفارش والا وسیلہ پکڑنا بھی جائز ہے، رہا آپ ﷺ کی وفات کے بعد آپ کی ذات کا وسیلہ پکڑنا، اسی طرح نیک لوگوں کا ان کی وفات کے بعد وسیلہ پکڑنا تو یہ ناجائز ہے، اسی بات کو امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔''

(تحفة الاحوذی : ٤/٢٨٣)

وسیلہ کی اس ممنوع وناجائز صورت پر دیئے جانے والے دلائل کا علمی اور تحقیقی جائزہ پیشِ خدمت ہے:

قرآنی دلیل نمبر ①: ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا﴾ (النساء : ٦٤)

''اور اگر وہ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھیں تو آپ کے پاس آئیں، پھر اللہ سے معافی مانگیں اور ان کے لیے اللہ کا رسول بھی معافی مانگے تو وہ اللہ تعالیٰ کو بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا اور نہایت رحیم پائیں گے۔''

تبصرہ : اس آیتِ مبارکہ میں تو یہ ثابت ہو رہا ہے کہ گناہ گار لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس آ کر خود اپنے گناہوں کی معافی مانگیں اور رسول اللہ ﷺ بھی ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی کا سوال کریں تو اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرما دے گا، دعا تو مشروع وسیلہ ہے، اس آیتِ کریمہ میں فوت شدگان کا وسیلہ پکڑنے کے متعلق کوئی ثبوت نہیں، یہ ہماری دلیل ہے جو وسیلہ کی مشروع صورت پر مبنی ہے، نہ کہ اہلِ بدعت کی جو وسیلہ ''بالذوات وبالاموات'' کے قائل ہیں۔

اس آیت کے ضمن میں حافظ ابنِ کثیر ''العتبی'' نامی آدمی کا ایک بے سند و بے ثبوت واقعہ بھی لائے ہیں۔

تنبیہ : ''ابوحرب ہلال کہتے ہیں کہ ایک دیہاتی نے فریضۂ حج ادا کیا، پھر وہ مسجدِ نبوی کے

دروازے پر آیا، وہاں اپنی اونٹنی بٹھا کر اسے باندھنے کے بعد وہ مسجد میں داخل ہوگیا، یہاں تک کہ آپ ﷺ کی قبر مبارک کے پاس آیا اور آپ کے پاؤں مبارک کی جانب کھڑا ہوگیا اور کہا، السّلام علیک یا رسول اللّٰہ!، پھر ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو سلام کیا، پھر آپ ﷺ کی قبر مبارک کی طرف بڑھا اور کہا، اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، میں گناہ گار ہوں، اس لیے آیا ہوں تا کہ اللہ کے ہاں آپ کو وسیلہ بنا سکوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآنِ مجید میں فرمایا ہے: ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا﴾(النساء : ٦٤)

(شعب الایمان للبیهقی : ٤٩٥/٣ ، ح : ٤١٧٨ ، وفی نسخة : ٣٨٨٠)

تبصرہ : یہ موضوع (من گھڑت) روایت ہے، کیونکہ: ① اس کی سند میں یزید بن ابان الرقاشی راوی ہے جو کہ جمہور کے نزدیک ''ضعیف'' ہے، حافظ ہیثمی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **ضعّفه الجمهور .**

''اس کو جمہور نے ضعیف قرار دیا ہے۔'' (مجمع الزوائد : ١٠٥/١٠)

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے اس کو ''ضعیف'' قرار دیا ہے۔ (تقریب التهذیب : ٧٦٨٣)

② محمد بن روح بن یزید المصری راوی کے حالات نہیں مل سکے۔

③ ابوحرب ہلال کا ترجمہ و توثیق بھی مطلوب ہے۔

④ عمرو بن محمد بن عمرو بن الحسین کے حالات و توثیق درکار ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ ''ضعیف'' اور ''مجہول'' راویوں کی کارستانی ہے، جس سے دلیل لینا اہل حق کا وطیرہ نہیں۔

قرآنی دلیل نمبر ②:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾(المائدة : ٣٥)

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اس کی طرف وسیلہ تلاش کرو اور اس کے راستے میں جہاد کرو تا کہ تم کامیاب ہوسکو۔''

تبصرہ : بالاتفاق اس وسیلہ سے مراد نیک اعمال ہیں، جیسا کہ حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وهذا الّذی قاله هؤلاء الأئمة لا خلاف بين المفسّرين .

''ان ائمہ کرام نے جو فرمایا ہے، اس میں مفسرین کے مابین کوئی اختلاف نہیں۔'' (تفسیر ابن کثیر : ٥٣٥/٢)

نیک اعمال کا وسیلہ پکڑنا مشروع اور جائز ہے، یہ اہل سنت والجماعت کی زبردست دلیل ہے، اہل

بدعت کا اس سے فوت شدگان کے وسیلہ پر دلیل پکڑنا قرآنِ مجید کی معنوی تحریف اور تاویلِ باطل ہے۔

حدیثی دلائل

① سیدنا عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک نابینا شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی، آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ مجھے شفا دے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر آپ چاہیں تو دعا کر دیتا ہوں اور اگر چاہیں تو صبر کر لیں، وہ آپ کے لیے بہتر ہے، اس نے کہا، آپ میرے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا ہی کر دیں، اس نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اچھی طرح سنوار کر وضو کرنے اور پھر دو رکعتیں پڑھ کر یہ دعا کرنے کا حکم دیا: **اللّٰھم انّی أسئلک و أتوجّه الیک بنبیّی محمّد نبیّ الرّحمة ، یا محمّد ! انّی أتوجّه الی ربّی بک أن یکشف لی عن بصری ، اللّٰھم شفّعه فیّ وشفّعنی فی نفسی .**

''اے اللہ! بے شک میں تجھ سے سوال کرتا ہوں، میں اپنے نبیٔ رحمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تیری طرف (دعا کے لیے) متوجہ کرتا ہوں، اے محمد! میں آپ کو اپنے رب کی طرف (دعا کے لیے) متوجہ کرتا ہوں کہ وہ میری نظر لوٹا دے، اے اللہ! تو میرے بارے میں اپنے نبی کی سفارش قبول فرما اور خود میری سفارش بھی قبول فرما۔

جب وہ واپس لوٹا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی نظر لوٹا دی تھی۔'' (مسند الامام احمد : ۱۳۸/٤ ، سنن الترمذی : ۳۵۷۸ ، السنن الکبرٰی ، عمل الیوم واللیلة للنسائی : ٦۵۹ ، واللفظ له ، سنن ابن ماجه : ۱۳۸۵ ، مسند عبد بن حمید : ۳۷۹ ، وسندهٗ حسن)

''اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے ''حسن صحیح غریب'' اور امام ابنِ خزیمہ رحمہ اللہ (۱۲۱۹) نے ''صحیح'' کہا ہے، امام ابن ماجہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابو اسحاق نے کہا ہے کہ یہ حدیث ''صحیح'' ہے، امام حاکم رحمہ اللہ (۳۱۳/۱) نے اس حدیث کو ''صحیح علی شرط الشیخین'' قرار دیا ہے، حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔

اہل بدعت نے اس حدیث سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے وسیلہ کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، ان کا یہ استدلال باطل، بلکہ ابطل الاباطیل ہے، کیونکہ حدیث میں مذکور ہے کہ اس شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست کی تھی، جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر آپ چاہیں تو میں دعا کر دیتا ہے، اگر دعا نہ کروائیں اور بیماری پر صبر کریں تو بہتر ہے، لیکن صحابی مذکور نے آپ کی دعا کو ترجیح دی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حق میں دعا و سفارش فرما دی، اس کو اچھی طرح وضو کرنے کا حکم دیا، پھر دو رکعت نماز ادا کرنے کو کہا اور اس کو دعا کے الفاظ بھی سکھا دیئے، اس نے ان الفاظ کے ساتھ اپنے حق میں دعا بھی کر دی اور کہا، ''اے اللہ! تو میرے بارے میں اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خود میری دعا و سفارش قبول فرما۔''

اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کے وسیلہ کا ذکر تک نہیں، بلکہ آپ کی حیاتِ طیبہ میں آپ کی دعا وسفارش کا وسیلہ پیش کرنے کا ذکر ہے، نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں یا وفات کے بعد کسی صحابی سے آپ کی ذات کا وسیلہ پیش کرنا قطعاً ثابت نہیں، حیاتِ مبارکہ میں آپ کی عدم موجودگی میں ذات کا وسیلہ پیش کرنا قطعاً ثابت نہیں ہے، اسی طرح آپ کی وفات کی بعد کسی صحابی یا تابعی سے آپ کی ذات کا وسیلہ پیش کرنا اور آپ کی قبر مبارک پر جا کر دعا کرنا ثابت نہیں ہے، مدعی پر دلیل لازم ہے۔

دلیل نمبر ②: ایک شخص سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس اپنی ضرورت میں آجایا کرتا تھا اور عثمان رضی اللہ عنہ (مشغولیت کی وجہ سے) اس کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے اور اس کی ضرورت میں غور نہ فرماتے تھے، وہ عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے ملا اور ان سے جا کر شکایت کی، سیدنا عثمان بن حنیف نے اس سے کہا، لوٹا لاؤ، وضو کرو، پھر مسجد جا کر دو رکعت نماز پڑھو، پھر کہو: **اللّٰھم انّی أسئلک ، و أتوجّه الیک بنبیّنا محمّد صلی الله علیه وسلم نبیّ الرّحمة ، یا محمّد ! انّی أتوجّه الی ربّی ، فیقضی حاجتی .**

''اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں، میں اپنے نبی رحمت محمد ﷺ کو تیری طرف متوجہ کرتا ہوں، اے محمد! میں آپ کو اپنے رب کی طرف (دعا کے لیے) متوجہ کرتا ہوں کہ وہ میری ضرورت کو پورا کر دے۔''

پھر اپنی ضرورت کو اللہ کے سامنے رکھ دو، پھر میرے پاس آجاؤ تا کہ میں آپ کے ساتھ چلوں، اس شخص کی ضرورت پوری ہوئی، سیدنا عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ یہی دعا ایک نابینا کو نبی کریم ﷺ نے سکھائی تھی تو اس کی تکلیف بھی دور ہوگئی تھی۔'' (التاریخ الکبیر للبخاری : ۲۱۰/۶ ، العلل لابن ابی حاتم الرازی : ۱۹۰/۲ ، المعجم الکبیر للطبرانی : ۳۰/۹-۳۱ ، ح ۸۳۱۱ ، المعجم الصغیر للطبرانی : ۱۸۳/۱-۱۸۴، الدعاء للطبرانی : ۱۲۸۷/۲-۱۲۸۸ ، ح : ۱۰۵۰ ، معرفة الصحابة لابی نعیم الاصبهانی : ۱۹۵۹/٤-۱۹۶۰ ، ح : ٤۹۲۸)

تبصرہ : اس کی سند ''ضعیف'' ہے، کیونکہ: ① عبداللہ بن وہب المصری ''مدلّس'' ہیں اور ''عن'' سے روایت کررہے ہیں، یہ مسلّم اصول ہے کہ جب ثقہ راوی بخاری ومسلم کے علاوہ ''عن'' یا ''قال'' کہہ کر روایت کرے تو وہ ''ضعیف'' ہوتی ہے۔

② عبداللہ بن وہب المصری یہ روایت اپنے استاذ شعیب بن سعید الحبطی (ثقہ) سے کررہے ہیں اور خود شعیب بن سعید اپنے استاذ روح بن القاسم سے روایت کررہے ہیں، امام الجرح والتعدیل ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ولشعیب بن سعید نسخة الزّهریّ عنده عن یونس عن الزّهریّ ، وهی

أحاديث مستقيمة ، وحدث عنه ابن وهب بأحاديث مناكير .

''شعیب کے پاس ایک نسخہ ہے جو وہ یونس کے واسطے سے زہری سے بیان کرتے ہیں اور وہ مستقیم احادیث ہیں، ابنِ وہب نے ان سے منکر احادیث بیان کی ہیں۔'' (الکامل لابن عدی : ۳۱/٤)

یہ روایت بھی شعیب بن سعید سے عبداللہ بن وہب المصری بیان کررہے ہیں، یہ جرح مفسر ہے، لہٰذا یہ روایت ''ضعیف'' اور ''منکر'' ہے، مطلب یہ ہے کہ شعیب بن سعید جب مصر میں گئے تو وہاں انہوں نے اپنے حافظہ سے احادیث بیان کیں، جن میں سے یہ غلطی اور وہم کا شکار ہو گئے۔

اعتراض : شعیب بن سعید ابوسعید البصری کی روایت صحیح بخاری میں بھی ہے۔

جواب : حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: أخرج البخاريّ من روايته ابنه (أحمد) عن يونس (بن يزيد الأيليّ) أحاديث لم يخرج من روايته عن غير يونس ، ولا من رواية ابن وهب عنه شيئا ...

''امام بخاری رحمہ اللہ نے ان کے بیٹے سے یونس بن یزید الایلی کی سند سے یونس کے علاوہ اور راویوں سے روایات لی ہیں، ابنِ وہب سے ان کی کوئی روایت بخاری میں نہیں ہے۔'' (ھدی الساری : ٤٠٩)

ثابت ہوا کہ شعیب بن سعید سے وہ روایت جو عبداللہ بن وہب المصری کے علاوہ کسی اور راوی نے بیان کی ہو اور وہ روایت اس نے اپنے استاذ یونس بن یزید الایلی سے کی ہو، وہ ''صحیح'' اور دوسری ''ضعیف'' ہوتی ہے۔

الحاصل : شعیب بن سعید سے اس کا شاگرد عبداللہ بن وہب المصری بیان کرے تو روایت ''منکر'' اور ''ضعیف'' ہوگی ، یہ روایت بھی عبداللہ بن وہب المصری بیان کررہے ہیں، لہٰذا یہ ''منکر'' اور ''ضعیف'' ہے، لہٰذا امام طبرانی رحمہ اللہ کا اس کو ''صحیح'' کہنا صحیح نہ ہوا۔

تنبیہ : اگر کوئی یہ کہے کہ عون بن عمارہ البصری نے شعیب بن سعید بن متابعت کررکھی ہے۔

(المستدرك للحاكم : ٥٢٦/١ ، معرفة الصحابة لابی نعيم الاصبهانی : ٤٩٢٩)

تو اس کا جواب یہ ہے کہ عون بن عمارہ البصری ''ضعیف'' ہے۔(تقریب التھذیب لابن حجر)

لہٰذا یہ متابعت مفید نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ عون بن عمارہ والی روایت میں ان الفاظ کی زیادتی موجود نہیں۔

دلیل نمبر ③: سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

انّ عمر بن الخطاب رضی الله عنه كان اذا قحطوا استسقىٰ بالعبّاس بن عبد المطّلب رضی الله عنه ، فقال : اللّٰهم انّا كنّا نتوسّل اليک بنبيّنا ، فتسقينا ، وانّا نتوسّل اليک بعمّ نبيّنا

فاسقنا ، قال : فيسقون .

''سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا طریقہ یہ تھا کہ جب قحط پڑ جاتا تو سیدنا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ (کی دعا) کو وسیلہ پکڑ کر بارش طلب کیا کرتے تھے اور یہ دعا کرتے تھے، اے اللہ! بے شک ہم تیرے سامنے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم (کی زندگی میں ان کی دعا) کو وسیلہ پکڑ کر بارش طلب کیا کرتے تھے تو تو ہمیں بارش دیتا تھا اور اب ہم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم (کی وفات کے بعد) ان کے چچا (کی دعا) کو وسیلہ بنا کر بارش طلب کرتے ہیں (یعنی ان سے دعا کرواتے ہیں)، تو ہم پر بارش نازل فرما، سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ان پر بارش نازل کی جاتی تھی۔

(صحیح بخاری : ۱۳۷/۱ ، ح : ۱۰۱۰)

حافظ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ اس حدیث کے الفاظ انّا کنّا نتوسّل کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں:

وذلک أنّ التّوسّل به فی حیاته ، هو أنّهم کانوا یتوسّلون به ، أی یسألون أن یدعو الله ، فیدعو لهم ، ویدعون فیتوسّلون بشفاعته ودعائه ...

''یہ وسیلہ کی صورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارکہ میں کچھ اس طرح تھی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست کرتے اور پھر خود بھی دعا کرتے تو اس طریقہ سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش اور وسیلہ چاہتے تھے۔'' (مختصر الفتاوی المصرية : ص ۱۹٤)

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **ویستفاد من قصّة العبّاس رضی الله عنه من استحباب الاستشفاع بأهل الخیر وأهل بیت النّبوّة .** ''سیدنا عباس رضی اللہ عنہما کے قصہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خیر و بھلائی، نیکی و تقویٰ والوں اور خاندانِ نبوت سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے سفارش کروانا مستحب ہے۔'' (فتح الباری : ٤٩٧/٢) یہ ہماری دلیل ہے، کیونکہ دعا مشروع وسیلہ ہے۔

دلیل نمبر ④: عبداللہ بن دینار کہتے ہیں: **سمعت ابن عمر یتمثّل بشعر أبی طالب :**

وأبیض یستسقیٰ الغمام بوجهه ثمال الیتامیٰ عصمة للأرامل .

''سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو میں نے ابو طالب کا یہ شعر پڑھتے ہوئے سنا، وہ گورے رنگ والے، جن کے چہرے کے توسّل سے بارش طلب کی جاتی ہے، یتیموں کے والی، بیواؤں کے سہارا ہیں۔''

(صحیح بخاری : ۱۳۷/۱ ، ح : ۱۰۰۸)

یہاں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا وسیلہ مراد ہے، جو کہ مشروع اور جائز ہے۔

وقال عمر بن حمزة : حدثنا سالم عن أبیه ، ربما ذکرت قول الشّاعر ، وأنا أنظر الی وجه

النّبيّ صلى الله عليه وسلم يستسقي ، فما ينزل حتّى يجيش كلّ ميزاب .

وأبيض يستسقىٰ الغمام بوجهه   ثمال اليتامىٰ عصمة للأرامل .

''عمر بن حمزہ کہتے ہیں کہ سالم بن عبداللہ بن عمر رحمہ اللہ نے اپنے والد سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ کبھی میں شاعر کی اس بات کو یاد کرتا ہوں کہ کبھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس کو تکتا کہ اس (رخِ زیبا) کے وسیلہ سے بارش طلب کی جاتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم (منبر سے) اترنے بھی نہ پائے تھے کہ سارے پرنالے بہنے لگے، مذکورہ شعر ابوطالب کا ہے۔'' (صحیح بخاری: ۱/۱۳۷، ح: ۱۰۰۹ تعلیقاً، سنن ابن ماجہ: ۱۲۷۲، مسند الامام احمد: ۲/۹۳، ح: ۵۶۷۳، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۳/۳۵۲، تغلیق التعلیق لابن حجر: ۲/۳۸۹)

تبصرہ : اس کی سند ''ضعیف'' ہے، اس میں عمر بن حمزہ (بن عبداللہ بن عمر) ''ضعیف'' ہے۔
(تقریب التہذیب لابن حجر: ٤٨٨٤)

یہ جمہور کے نزدیک ''ضعیف'' راوی ہے، صحیح مسلم میں اس کی روایت صحیح اور باقی ''ضعیف'' ہوگی۔

امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے اس کو ''ضعیف'' کہا ہے۔ (تاریخ الدارمی عن بن معین: ص ۱٤۲)

امام نسائی رحمہ اللہ نے بھی اسے ''ضعیف'' ہی قرار دیا ہے، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

أحاديثه أحاديث مناكير . ''اس کی احادیث منکر احادیث ہیں۔'' (الجرح والتعدیل: ٦/١٠٤)

امام ابنِ عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وهو ممّن يكتب حديثه . ''یہ ان (ضعیف راویوں) میں سے ہے، جن کی احادیث لکھی جاتی ہیں۔'' (الکامل فی ضعفاء الرجال لابن عدی: ٥/١٩)

لہٰذا امام ابنِ حبان رحمہ اللہ کا اس کو ''الثقات'' میں ذکر کرنا اور امام حاکم رحمہ اللہ کا اس کی احادیث کو مستقیم قرار دینا محلِ نظر ہے۔

تنبیہ : سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے یہی شعر پڑھا۔ اس وقت ابوبکر ایک فیصلہ فرما رہے تھے، یہ شعر سن کر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ (مسند الامام احمد: ۱/۷، مصنف ابن ابی شیبۃ: ۱۲/۲۰، طبقات ابن سعد: ۳/۱۹۸، مسند ابی بکر للمروزی: ۱/۹۷)

تبصرہ : اس کی سند ''ضعیف'' ہے، اس کا راوی علی بن زید بن جدعان جمہور کے نزدیک ''ضعیف'' ہے، نیز یہ ''مختلط'' بھی ہے، حافظ ہیثمی کہتے ہیں: وضعّفه الجمهور . (مجمع الزوائد: ۸/۲۰٦،۲۰۹)

حافظ ابن العراقی کہتے ہیں: ضعّفه الجمهور . (طرح التثریب: ۱/۸۲)

حافظ ابن الملقن کہتے ہیں: وادّعى عبد الحقّ أنّ الأكثر على تضعيف علي بن زيد .

''اورعبدالحق نے دعویٰ کیا ہے کہ اکثر محدثین علی بن زید کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔'' (البدر المنیر : ٤/٤٣٤)

اس کو امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ بن معین، امام ابن عدی (الکامل : ٤/٣١٣) امام ابوحاتم الرازی اور ابوزرعہ الرازی وغیرہ نے ''ضعیف، لیس بالقوی'' کہا ہے، نیز حافظ ابنِ حجر نے بھی ''ضعیف'' کہا ہے۔ (تقریب التہذیب : ٤٧٣٤)

دلیل نمبر ⑤: ابوالجوزاء اوس بن عبداللہ تابعی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

قحط المدينة قحطا شديدا ، فشكوا الى عائشة رضى الله عنها ، فقالت : انظروا قبر النّبيّ صلى الله عليه وسلم ، فاجعلوا منه كوى الى السّماء حتى لا يكون بينه وبين السّماء سقف ، قال: ففعلوا ، فمطرنا مطرا حتى نبت العشب وسمنت الابل حتى تفتقت من الشّحم عام الفتق .

''ایک مرتبہ اہلِ مدینہ سخت قحط میں مبتلا ہو گئے، انہوں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے (اس کیفیت کے بارے میں) شکایت کی، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس جاؤ اور وہاں سے ایک کھڑکی آسمان کی طرف اس طرح کھولو کہ قبر اور آسمان کے درمیان کوئی پردہ حائل نہ رہے، راوی کہتا ہے کہ لوگوں نے اسی طرح کیا تو بہت زیادہ بارش ہوئی یہاں تک کہ خوب سبزہ اُگ آیا اور اونٹ ایسے ہو گئے کہ (محسوس ہوتا تھا) جیسے وہ چربی سے پھٹ پڑیں گے، لہٰذا اس سال کا نام عام الفتق (پیٹ پھٹنے والا سال) رکھ دیا گیا۔''

(مسند الدارمی : ٩٣ ، مشکاۃ المصابیح : ٥٦٥٠)

تبصرہ : اس کی سند ''ضعیف'' ہے، اس کے راوی عمرو بن مالک النکری (ثقہ) کی حدیث ابوالجوزاء سے غیر محفوظ ہوئی ہے، یہ روایت بھی اسی سے ہے، حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وقال ابن عديّ (الکامل : ١/٤١١)**: حدّث عنه عمرو بن مالك قدر عشرة أحاديث غير محفوظة .**

''امام ابن عدی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ابوالجوزاء سے عمرو بن مالک نے تقریباً دس غیر محفوظ احادیث بیان کی ہیں۔'' (تهذيب التهذيب لابن حجر : ١/٣٣٦)

یہ جرح مفسر ہے، یہ حدیث بھی عمرو بن مالک النکری نے اپنے استاذ ابوالجوزاء سے روایت کی ہے، لہٰذا غیر محفوظ ہے۔

اس کا الزامی جواب یہ ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: **ومن حدّثك أنّه يعلم الغيب ، فقد كذب ، وهو يقول : لا يعلم الغيب الّا اللّه .** ''جو کوئی تجھے یہ بتائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم غیب جانتے ہو، وہ جھوٹا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ غیب کی باتوں کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

(صحیح بخاری : ۱۰۹۸/۲ ، ح : ۷۳۸۰ ، صحیح مسلم : ۹۸/۱ ، ح : ۱۷۷)

اس کے جواب میں ''بعض الناس'' نے لکھا ہے: ''آپ کے یہ قول اپنے رائے سے ہیں، اس پر کوئی حدیثِ مرفوع پیش نہیں فرماتیں، بلکہ آیات سے استدلال فرماتی ہیں۔'' («جاء الحق» : ۱۲۴/۱)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے متعلق یہ قول قبول کیوں ہے؟ جب کہ وہ اس پر کوئی آیت یا حدیث پیش نہیں فرما رہیں، اس پر سہاگہ یہ کہ یہ قول ثابت بھی نہیں ہے۔

دلیل نمبر ⑥: عن مالک الدّار قال : أصاب النّاس قحط فی زمن عمر ، فجاء رجل الی قبر النّبیّ صلی اللّٰه علیه وسلم ، فقال : یا رسول اللّٰه استسق لأمّتک ، فانّهم قد هلکوا، فأتی الرّجل فی المنام ، فقیل له : ائت عمر ، فأقرئه السّلام وأخبره أنّکم مسقیون ، وقل له : علیک الکیس ، علیک الکیس ! فأتی عمر ، فأخبره ، فبکیٰ عمر ، ثم قال : یا ربّ ! لا آلو الّا ما عجزت منه .

''مالک الدار سے روایت ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں لوگ قحط میں مبتلا ہو گئے، پھر ایک صحابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر حاضر ہوئے اور عرض کی، اے اللہ کے رسول! آپ (اللہ تعالیٰ سے) اپنی امت کے لیے سیرابی مانگیں، کیونکہ وہ (قحط سالی کے باعث) تباہ ہوگئی ہے، پھر خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس صحابی کے پاس تشریف لائے اور فرمایا، عمر کے پاس جا کر اسے میرا سلام کہو اور اسے بتاؤ کہ تم سیراب کیے جاؤ گے اور عمر سے (یہ بھی) کہہ دو کہ عقلمندی اختیار کیا کرو، وہ صحابی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور انہیں خبر دی تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے اور فرمایا، اے اللہ! میں کوتاہی نہیں کرتا، مگر یہ کہ عاجز ہو جاؤں۔''

(مصنف ابن ابی شیبة : ۳٥٦/٦ ، دلائل النبوة للبیهقی : ٤٧/٧ ، الاستیعاب لابن عبد البر : ۱۱٤٩/۳)

تبصرہ : اس کی سند ''ضعیف'' ہے، اس میں (محمد بن خازم الضریر) ابومعاویہ اور (سلیمان بن مہران) الاعمش دونوں ''مدلّس'' ہیں اور ''عن'' سے روایت کر رہے ہیں، سماع کی تصریح نہیں، لہٰذا سند ''ضعیف'' ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: فقلنا : لا نقبل من مدلّس حدیثا حتی یقول فیه : حدّثنی أو سمعت ... ''ہم کسی مدلّس سے کوئی بھی حدیث اس وقت تک قبول نہیں کرتے جب تک وہ اس میں سماع کی تصریح نہ کر دے۔'' (الرسالة للامام الشافعی : ص ۳۸۰)

امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لا یکون حجّة فیما دلّس . ''مدلس راوی تدلیس والی روایت میں حجت نہیں ہوتا۔'' (الکامل لابن عدی: ۳٤/۱ ، وسندهٔ حسن)

اس روایت کی صحت کے مدعی پر سماع کی تصریح لازم ہے، لہذا حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ (البدایة والنهایة: ١٦٧/٥) اور حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ (الاصابة: ٤٨٤/٣) کا اس کی سند کو ''صحیح'' قرار دینا صحیح نہیں۔

دلیل نمبر ⑥: سیدنا ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: **استسقیٰ عمر بن الخطّاب عام الرّمادة بالعبّاس بن عبد المطّلب ، فقال : اللّٰھم ھذا عمّ نبیّک العبّاس ، نتوجّه الیک به ، فاسقنا ، فما برحوا حتی سقاھم اللّٰه ، قال : فخطب عمر النّاس ، فقال : ایّھا النّاس ! انّ رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم کان یری للعبّاس ما یری الوالد لولده ، یعظّمه ویفحمه ویبرّ قسمه ، فاقتدوا أیّھا النّاس برسول اللّٰه فی عمّه العبّاس واتّخذوه وسیلة الی اللّٰه عزّ وجلّ فیما نزل بکم .**

''سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عام الرمادہ (قحط و ہلاکت والے سال) میں سیدنا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ (کی دعا) کو وسیلہ بنا کر بارش طلب کی، عرض کی، اے اللہ! یہ تیرے (مکرّم) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے (معزز) چچا عباس ہیں، ہم ان (کی دعا کے) ساتھ تیری طرف متوجہ ہوتے ہیں، تو ہم پر بارش نازل فرما، وہ دعا کر ہی رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پانی سے سیراب کر دیا، راوی نے بیان کیا ہے کہ پھر سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو خطبہ دیا، فرمایا، اے لوگو! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کو ویسا ہی سمجھتے تھے، جیسا کہ بیٹا باپ کو سمجھتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تعظیم و توقیر کرتے اور ان کی قسموں کو پورا فرماتے تھے، اے لوگو! تم بھی سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرو، ان (کی دعا) کو اللہ تعالیٰ کے ہاں وسیلہ بناؤ تاکہ وہ تم پر (بارش) برسائے۔'' (المستدرك للحاکم: ٣٣٤/٣ ، ح: ٥٦٣٨ ، الاستیعاب لابن عبد البر: ٩٨/٣)

تبصرہ : اس کی سند سخت ترین ''ضعیف'' ہے، اس میں داؤد بن عطاء المدنی راوی ''ضعیف'' اور ''متروک'' ہے، اس کے بارے میں توثیق کا ادنیٰ لفظ بھی ثابت نہیں، امام ابوحاتم الرازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: **لیس بالقویّ ، ضعیف الحدیث ، منکر الحدیث.** ''قوی نہیں ہے، ضعیف الحدیث اور منکر الحدیث ہے۔'' امام ابوزرعہ رحمہ اللہ نے ''منکر الحدیث'' کہا ہے۔ (الجرح والتعدیل: ٤٢١/٣)

امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی ''منکر الحدیث'' قرار دیا ہے۔ (الضعفاء الکبیر للعقیلی: ٣٥/٢ ، وسندهٔ صحیح)

امام دارقطنی رحمہ اللہ نے ''متروک'' قرار دیا ہے۔(سوالات البرقانی للدارقطنی : ۱۳۸)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **لیس بشیئ .** ''یہ کچھ بھی نہیں ہے۔''(الجرح والتعدیل:۴۲۷/۳)

امام ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **وفی حدیثه بعض النکرة .** ''اس کی حدیث میں کچھ خرابی ہے۔''(الکامل لابن عدی : ۸۷/۳) یہ ہماری دلیل ہے، کیونکہ دعا مشروع اور جائز وسیلہ ہے۔

دلیل نمبر ⑧: سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لمّا أذنب آدم صلى الله عليه وسلم الذّنب رفع رأسه الى العرش ، فقال : أسألک بحقّ محمّد الّا غفرت لى ، فأوحى اللّٰه اليه ، وما محمّد ؟ ومن محمّد ؟ فقال : تبارک اسمک ، لمّا خلقتنى رفعت رأسى الى عرشک ، فاذا فيه مكتوب مكتوبا : لا اله الّا اللّٰه ، محمّد رسول اللّٰه ، فعلمت أنّه ليس أحد أعظم عندک قدرا ممن جعلت اسمه مع اسمک ، فأوحى اللّٰه عزّ وجلّ اليه : يا آدم ! انّه آخر النّبيّين من ذريّتک ، وانّ أمّته آخر الأمم من ذريّتک ، لولاه يا آدم ! ما خلقتک .

''جب آدم علیہ السلام سے خطا سرزد ہوئی تو انہوں نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا اور عرض گزار ہوئے، (اے اللہ!) اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا تو میں بحق محمد تجھ سے سوال کرتا ہوں (کہ تو مجھے معاف کردے)، اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی، محمد کون ہیں؟ سیدنا آدم علیہ السلام نے عرض کی، (اے اللہ!) تیرا نام پاک ہے، جب تو نے مجھے پیدا کیا تھا تو میں نے اپنا سر تیرے عرش کی طرف اٹھایا تھا، وہاں میں نے **لا اله الّا اللّٰه ، محمّد رسول اللّٰه** لکھا ہوا دیکھا، لہٰذا میں جان گیا کہ یہ ضرور کوئی بڑی ہستی ہے، جس کا نام تو نے اپنے نام کے ساتھ ملایا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے وحی کی، اے آدم! وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تیری نسل میں سے آخری نبی ہیں، ان کی امت بھی تیری نسل میں سے آخری امت ہوگی اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے تو میں تجھے پیدا ہی نہ کرتا۔''

(المعجم الصغیر للطبرانی : ۱۸۲/۲ ، ح : ۹۹۲ ، وفی نسخة : ۸۲/۲ ، المعجم الاوسط للطبرانی : ٦٥٠٢)

تبصرہ : یہ موضوع (من گھڑت) روایت ہے، کیونکہ: ① اس میں عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم راوی جمہور کے نزدیک ''ضعیف ومتروک'' ہے، حافظ ہیثمی لکھتے ہیں: **والأكثر على تضعيفه .**

''جمہور اس کو ضعیف کہتے ہیں۔''(مجمع الزوائد : ۲۱/۲)

حافظ ابن ملقن رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **ضعّفه الكلّ .** ''اسے سب نے ضعیف قرار دیا ہے۔''

(البدر المنیر : ٤٥٨/٥)

اس کو امام احمد بن حنبل، امام علی بن المدینی، امام بخاری، امام یحییٰ بن معین، امام نسائی، امام ابوحاتم الرازی، امام ابوزرعہ الرازی، امام ابنِ سعد، امام ابنِ خزیمہ، امام ابنِ حبان، امام ساجی، امام طحاوی حنفی، امام جوزجانی رحمہم اللہ وغیرہم نے ''ضعیف'' قرار دیا ہے۔

امام حاکم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **روی عن أبیه أحادیث موضوعة .** ''اس نے اپنے باپ سے موضوع (من گھڑت) احادیث بیان کی ہیں۔(المدخل للحاکم : ۱۵۴)

یہی بات امام ابونعیم الاصبہانی رحمہ اللہ نے بھی کہی ہے۔(تھذیب التھذیب لابن حجر : ۱۶۲/۶)

یہ حدیث بھی اس نے اپنے باپ سے روایت کی ہے، لہٰذا موضوع (من گھڑت) ہے۔

② امام طبرانی رحمہ اللہ کے استاذ محمد بن داؤد بن عثمان الصدفی المصری کی توثیق مطلوب ہے۔

③ اس کے راوی احمد بن سعید المدنی الفہری کی بھی توثیق مطلوب ہے۔

دلیل نمبر ⑨: سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا انفلتت دابّة أحدکم بأرض فلاة فلیناد : یا عباد اللّٰه ! أحبسوا علیّ ، یا عباد اللّٰه ! أحبسوا علیّ ، فانّ للّٰه فی الأرض حاضرا ، سیحبسه علیکم .

''جب تم میں سے کسی کی سواری جنگل بیابان میں چھوٹ جائے تو اس شخص کو یہ پکارنا چاہیے، اے اللہ کے بندو! میری سواری کو پکڑا دو، اے اللہ کے بندو! میری سواری کو پکڑا دو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے بندے (فرشتے) اس زمین میں ہوتے ہیں، وہ تمہیں (تمہاری سواری) پکڑا دیں گے۔''(مصنف ابن ابی شیبة : ۱۰۳/۶ ، المعجم الکبیر للطبرانی : ۲۱۷/۱۰ ، ح : ۱۰۵۱۸ ، واللفظ له ، مسند ابی یعلیٰ : ۵۲۶۹ ، عمل الیوم واللیلة لابن السنی : ۵۰۹)

تبصرہ : اس کی سند کئی وجوہ سے سخت ترین ''ضعیف'' ہے:

① معروف بن حسان ''غیر معروف'' اور ''مجہول'' ہے، امام ابوحاتم الرازی رحمہ اللہ نے اسے ''مجہول'' قرار دیا ہے۔(الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم : ۳۲۳/۸)

امام ابن عدی رحمہ اللہ نے اسے ''منکر الحدیث'' کہا ہے۔(الکامل فی ضعفاء الرجال : ۳۲۵/۶)

حافظ ہیثمی رحمہ اللہ نے بھی اسے ''ضعیف'' قرار دیا ہے۔(مجمع الزوائد : ۱۳۲/۱۰)

اس کی توثیق میں ادنیٰ کلمہ بھی ثابت نہیں۔

② اس میں قتادہ بن دعامہ تابعی ''مدلس'' ہیں جو کہ ''عن'' سے بیان کر رہے ہیں، سماع کی تصریح ثابت

نہیں۔

③ سعید بن ابی عروبہ بھی ''مدلس'' اور ''مختلط'' ہیں۔

④ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **حديث غريب أخرجه ابن السّنّيّ والطبرانيّ ، وفي السّند انقطاع بين ابن بريدة وابن مسعود .** ''یہ غریب حدیث ہے جسے ابن السنی اور طبرانی نے بیان کیا ہے، اس کی سند میں ابنِ بریدہ اور سیدنا ابنِ مسعود کے درمیان انقطاع ہے۔'' (شرح الاذكار لابن علان : ١٥٠/٥)

ابن السنی کی سند میں ابنِ بریدہ اور سیدنا ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کے درمیان **عن أبيه** کا واسطہ ہے، یہ ناسخ کی غلطی ہے، کیونکہ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے اس سند کو ''منقطع'' قرار دیا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ یہی سند ابو یعلیٰ کی بھی ہے، مسند ابی یعلیٰ میں بھی یہ واسطہ مذکور نہیں، لہٰذا اس کا ''منقطع'' ہونا واضح ہے۔

علامہ بوصیری اس کے بارے میں کہتے ہیں: **وسنده ضعيف لضعف معروف بن حسان .**

''اس کی سند معروف بن حسان کے ضعیف ہونے کی بنا پر ضعیف ہے۔'' (اتحاف الخيرة المهرة : ٥٠٠/٧)

حافظ سخاوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **وسنده ضعيف ، لكن قال النّوويّ : انّه جرّبه هو وبعض أكابر شيوخه .** ''اس کی سند تو ضعیف ہے، لیکن حافظ نووی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ انہوں نے اور ان کے بعض اکابر شیوخ نے اس کا تجربہ کیا ہے۔'' (الابتهاج باذكار المسافر والحاج للسخاوي : ص ٣٩)

اس کے تعاقب میں ناصر السنۃ محدث العصر علامہ البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

العبادات لا تؤخذ من التّجارب ، سيّما ما كان منها في أمر غيبيّ كهذا الحديث ، فلا يجوز الميل الىٰ تصحيحة ، كيف وقد تمسّک به بعضهم في جواز الاستغاثة بالموتىٰ عند الشّدائد ، وهو شرک خالص ، والله المستعان !

''عبادات تجربوں سے اخذ نہیں کی جاسکتیں، خصوصاً ایسی عبادات جو کسی غیبی امر کے بارے میں ہوں، جیسا کہ یہ حدیث ہے، لہٰذا تجربے کو بنیاد بنا کر اس کو صحیح قرار دینے کی طرف مائل ہونا جائز نہیں، یہ کیسے ممکن ہے، حالانکہ بعض لوگوں نے اس سے مصیبتوں کے وقت مردوں سے مدد مانگنے پر بھی استدلال کیا ہے، یہ خالص شرک ہے، اللہ محفوظ فرمائے!'' (سلسلة الاحاديث الضعيفة : ١٠٨/٢۔١٠٩ ، ح : ٦٥٥)

دلیل نمبر ⑩: عتبہ بن غزوان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

اذا أضلّ أحدكم شيئا أو أراد أحدكم عونا ، وهو بأرض ليس بها أنيس ، فليقل : يا عباد

اللّٰہ ! أغیثونی ، یا عباد اللّٰہ ! أغیثونی ، بأنّ للّٰہ عبادا لا نراھم وقد جُرّبَ ذلک .

''جب تم میں سے کسی کی کوئی چیز گم ہو جائے یا تم میں سے کسی کو مدد چاہیے ہو اور وہ ایسی جگہ میں ہو جہاں اس کا کوئی مددگار نہ ہو تو اسے چاہیے کہ کہے، اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو، اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے بھی ہیں جنہیں ہم دیکھ نہیں سکتے اور یہ تجربہ شدہ بات ہے۔''

(المعجم الکبیر للطبرانی : ١١٧/١٧۔١١٨)

تبصرہ: یہ روایت ''ضعیف'' ہے، حافظ ہیثمی لکھتے ہیں: انّ زید بن علی لم یدرک عتبة. ''یقیناً زید بن علی نے عتبہ کو نہیں دیکھا۔''(مجمع الزوائد : ١٣٢/١٠)

دلیل نمبر ۱۱ : سیدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ابغونی فی ضعفائکم ، فانّما ترزقون وتنصرون بضعفائکم .

''مجھے اپنے کمزور لوگوں میں تلاش کرو، بے شک تمہیں اپنے کمزوروں کی وجہ سے رزق دیا جاتا ہے اور ان ہی کی وجہ سے تمہاری مدد کی جاتی ہے۔''(مسند الامام احمد : ١٩٨/٥ ، سنن ابی داؤد : ٢٥٩٤ ، سنن النسائی : ٣١٨١ ، سنن الترمذی : ١٧٠٢ ، وسندہٗ صحیح) امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ''حسن صحیح''، امام ابنِ حبان رحمہ اللہ نے ''صحیح'' اور امام حاکم رحمہ اللہ (١٠٤/٢، ١٤٥) نے ''صحیح الاسناد'' کہا ہے۔

معاشرہ کے کمزور اور نادار لوگ جو صالحین ہوں، ان کی نیکی اور دعا کی وجہ سے معاشرہ میں آسودگی آتی ہے، ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: انّما ینصر اللّٰہ ھذہ الأمّة بضعیفھا ، بدعوتھم وصلاتھم واخلاصھم . ''اللہ تعالیٰ اس امت کی مدد ان کی کمزور لوگوں کی دعا، نماز اور ان کے اخلاص کی وجہ سے کرتا ہے۔''(سنن النسائی : ٣١٨٠ ، حلیة الاولیاء لابی نعیم الاصبھانی : ٢٦/٥ ، وسندہٗ صحیح)

لہٰذا ایسے لوگوں کا خیال رکھنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کا موجب ہے، اس سے مبتدعین کا فوت شدگان کے توسّل کا مسئلہ نکالنا شرعی نصوص کی تحریف ہے۔

دلیل نمبر ۱۲ : سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو خانے میں تین مرتبہ لَبَّیْکَ کہا اور تین مرتبہ نُصِرْتَ (تیری مدد کی گئی) کہا، میں نے عرض کی، اے اللہ کے رسول! میں نے آپ کو تین مرتبہ لَبَّیْکَ اور تین مرتبہ نُصِرْتَ فرماتے ہوئے سنا ہے، جیسے آپ کسی انسان سے گفتگو کر رہے ہوں، کیا وضو خانے میں کوئی آپ کے ساتھ تھا؟ آپ نے فرمایا، یہ بنوکعب کا رجز

خواں مجھے پکار رہا تھا اور اس کا کہنا ہے کہ قریش نے ان کے خلاف بنو بکر کی امداد کی ہے، تین دن کے بعد آپ نے صحابہ کرام کو صبح کی نماز پڑھائی تو میں نے سنا کہ رجز خواں اشعار پیش کر رہا تھا۔'' (المعجم الكبير للطبرانی : ٢٣/٤٣٣ـ٤٣٤ ، ح : ١٠٥٢ ، المعجم الصغير للطبرانی : ٢/٧٣ـ٧٥)

تبصرہ : اس کی سند ''ضعیف'' ہے، اس کے راوی محمد بن نصلہ کے حالات نہیں مل سکے۔

تنبیہ : حافظ ہیثمی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس روایت میں یحییٰ بن سلیمان بن نصلہ راوی ''ضعیف'' ہے۔ (مجمع الزوائد : ٦/١٦٤)

لیکن راجح یہی ہے کہ یحییٰ بن سلیمان بن نصلہ راوی ''حسن الحدیث'' ہے۔ **والله أعلم وعلمه أحكم**

دلیل نمبر ١٣ : سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت ١٨ ہجری میں قحط سالی واقع ہوئی، اسی سال کو عام الرمادہ کہتے ہیں، ہلال بن حارث مزنی سے ان کی قوم بنو مزینہ نے کہا کہ ہم مرے جا رہے ہیں، کوئی بکری ذبح کیجیے، کہا، بکریوں میں کچھ نہیں رہا، اصرار بڑھا تو انہوں نے بکری ذبح کر دی، جب اس کی کھال اتاری تو نیچے سے سرخ ہڈی نکلی، یہ دیکھ کر ہلال مزنی نے **یا محمّدا** کہا، رات ہوئی تو انہوں نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں فرما رہے ہیں کہ تمہیں زندگی مبارک ہو۔''

(البداية والنهاية لابن كثير: ٧/٩١)

تبصرہ : یہ روایت موضوع (من گھڑت) ہے، کیونکہ: ① **سیف بن عمر الکوفی** راوی بالاتفاق ''ضعیف و متروک'' ہے، اس کی روایت سے وہی حجت پکڑے گا جو خود اس کی طرح ''ضعیف و متروک'' ہوگا۔ ② اس کا استاذ مبشر بن فضیل ''مجہول'' ہے۔

امام عقیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **مجهول بالنّقل ، اسنادهُ لا يصحّ .** ''یہ نقل میں مجہول ہے، اس حدیث کی سند صحیح نہیں۔'' (الضعفاء للعقيلی : ٤/٢٣٦) حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **لايدرىٰ من هو .** ''نہ معلوم یہ کون ہے؟'' (ميزان الاعتدال : ٣/٤٣٤) ③ اس کے راوی جبیر بن صخر کی توثیق مطلوب ہے۔

دلیل نمبر ١٤ : جنگِ یمامہ میں مسیلمہ کذاب کے ساتھ فوج کی تعداد ساٹھ ہزار تھی، جب کہ مسلمانوں کی تعداد کم تھی، مقابلہ بہت شدید تھا، ایک وقت نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مسلمان مجاہدین کے پاؤں اکھڑنے لگے، سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سپہ سالار تھے، انہوں نے یہ حالت دیکھی تو:

نادیٰ بشعار المسلمين ، وكان شعارهم يومئذ : يا محمّداه . ''انہوں نے مسلمانوں کا

نعرہ بلند کیا، اس دن ان کا نعرہ **یا محمّداہ** تھا۔'' (تاریخ الطبری : ۲۸۱/۲ ، البدایة والنهایة لابن کثیر : ۳۲٤/٦)

تبصرہ : یہ روایت موضوع (من گھڑت) ہے، اس میں وہی سیف بن عمر الکوفی راوی بالاتفاق ''ضعیف و متروک'' موجود ہے، نیز اس میں اور بھی علتیں ہیں۔

دلیل نمبر ۱۵ : سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے سیدنا کعب بن ضمرہ رضی اللہ عنہ کو ایک ہزار افراد کے ہمراہ حلب کا جائزہ لینے کے لیے روانہ کیا، جب وہ حلب کے قریب پہنچے تو یوقنا پانچ ہزار افراد کے ساتھ حملہ آور ہوا، مسلمان جم کر لڑنے لگے، اتنے میں پیچھے چھپے ہوئے پانچ ہزار افراد کے لشکر نے حملہ کر دیا، اس خطرناک صورتِ حال نے مسلمانوں کو بے حد پریشان کر دیا، کعب بن ضمرہ رضی اللہ عنہ نے جھنڈا تھامے ہوئے بلند آواز سے پکارا: **یامحمّد ، یا محمّد ، یا نصر اللّٰه ! انزل !**

''اے محمد! اے محمد! اے اللہ کی مدد، اتر آ۔'' (فتوح الشام لمحمد بن عمر الواقدی : ۱۹٦/۱ ، طبع مصر : ۱۹۳٤)

تبصرہ : یہ روایت سخت ترین ''ضعیف'' ہے، اس کا راوی محمد بن عمر الواقدی جمہور کے نزدیک ''ضعیف، متروک اور کذاب'' ہے، ابنِ ملقن رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **وقد ضعّفه الجمهور .**

''اسے جمہور نے ضعیف قرار دیا ہے۔'' (البدر المنیر لابن الملقن : ۳۲٤/٥) حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے اسے ''متروک'' کہا ہے۔ (تقریب التهذیب : ٦١٧٥) امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **کتب الوقدیّ کذب .** ''واقدی کی کتابیں جھوٹ کا پلندا ہیں۔'' (الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم : ۲۱/۸ ، وسندهٔ صحیح) امام اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **لأنّه عندی ممن یضع الحدیث .** ''میرے نزدیک یہ جھوٹی احادیث گھڑنے والا ہے۔'' (الجرح والتعدیل : ۲۱/۸) امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اسے ''کذاب'' قرار دیا ہے۔ (الکامل لابن عدی : ۲٤۱/٦ ، وسندهٔ حسن) امام بخاری، امام ابوزرعہ، امام نسائی اور امام عقیلی رحمہم اللہ نے اسے ''متروک الحدیث'' کہا ہے، امام یحییٰ بن معین اور جمہور نے ''ضعیف'' کہا ہے، امام ابنِ عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **یروی أحادیث غیر محفوظة والبلاء منه ، ومتون أخبار الواقدیّ غیر محفوظة ، وهو بیّن الضّعف .**

''یہ غیر محفوظ احادیث بیان کرتا ہے اور یہ مصیبت اسی کی طرف سے ہے، واقدی کی احادیث کے متون غیر محفوظ ہیں، وہ واضح ضعیف راوی ہے۔'' (الکامل فی ضعفاء الرجال لابن عدی : ۲٤۳/٦)

دلیل نمبر ۱٦ : ہیثم بن عدی کہتے ہیں کہ بنو عامر نے بصرہ میں اپنے جانور کھیتی میں

چرائے، انہیں طلب کرنے کے لیے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بھیجے گئے، بنو عامر نے بلند آواز سے اپنی قوم آلِ عامر کا بلایا تو نابغہ جعدی اپنے رشتہ داروں کی ایک جماعت کے ساتھ نکلے، انہیں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے پاس لایا گیا، آپ نے پوچھا، آپ کیوں نکلے ہیں؟ انہوں نے کہا، میں نے اپنی قوم کی پکار سنی تھی، ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے انہیں تازیانے لگائے، اس پر نابغہ جعدی نے کہا:

فان تک لابن عفّان أمينا فلم يبعث بک البرّ الأمينا

ويا قبر النّبيّ وصاحبيــه ألا يا غوثنا لو تسمعونــا

''اگر تو عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا امین ہے تو انہوں نے تجھے احسان کرنے والا امین بنا کر نہیں بھیجا، اے نبی اور آپ کے دو صاحبوں کی قبر! اے ہمارے فریادرس! کاش آپ ہماری فریاد سن لیں۔'' (الاستیعاب: ۵۸۶/۳)

تبصرہ : یہ روایت موضوع (جھوٹ کا پلندا) ہے، اس کا راوی ہیثم بن عدی بالاتفاق ''کذاب'' اور ''متروک الحدیث'' ہے۔

دلیل نمبر ۱۷ : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے واپسی پر جعرانہ تشریف لائے، اس وقت قبیلۂ ہوازن کے بچوں اور عورتوں میں سے چھ ہزار قیدی آپ کے ہمراہ تھے، اونٹوں اور بکریوں کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا، ہوازن کا ایک وفد مشرف بہ اسلام ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، انہوں نے درخواست کی کہ ہم پر احسان فرمائیں، آپ نے فرمایا، قیدیوں اور اموال میں سے ایک چیز پسند کر لو، انہوں نے عرض کی، ہمیں قیدی محبوب ہیں، آپ نے فرمایا، جو قیدی میرے ہیں یا بنو عبدالمطلب کے ہیں، وہ تمہارے ہیں، باقی جو تقسیم ہو چکے ہیں، ان کے لیے یہ طریقہ اختیار کرو:

اذا أنا صلّيت الظّهر بالنّاس فقوموا ، فقولوا : انّا نستشفع برسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم الى المسلمين وبالمسلمين الى رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم فى آبائنا ونسائنا ، فسأعطيكم عند ذلک وأسأل لكم .

''جب میں لوگوں کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھ لوں تو تم کھڑے ہو کر کہنا، ہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کرتے ہیں کہ مسلمانوں سے ہماری شفاعت (سفارش) فرمائیں اور مسلمان ہماری شفاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کریں، ہمارے بیٹوں اور عورتوں کے حق میں، تو میں تمہیں اس وقت عطا کر دوں گا اور تمہاری سفارش کروں گا۔''

چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، اکثر صحابہ نے عرض کی، جو کچھ ہمارے پاس ہے، وہ آپ کا ہے، باقی صحابہ سے آپ

نے وعدہ فرمایا کہ ہر قیدی کے بدلے مالِ غنیمت سے چھ اونٹنیاں دی جائیں گی، اس طرح ہوازن کو تمام قیدی واپس مل گئے۔(سیرۃ ابن ھشام مع الروض الانف : ۳۰۶/۲ ، وسندہٗ حسن)**زندہ انسان سے دعا وسفارش کروانا جائز ہے، یہ ہماری دلیل ہے۔**

دلیل نمبر ۱۸ : عبدالرحمٰن بن سعد کہتے ہیں: **كنت عند ابن عمر رضى الله عنهما ، فخدرت رجله ، فقلت : يا أبا عبد الرّحمن ! ما لرجلک ؟ قال : اجتمع عصبها من هاهنا ، فقلت : أدع أحب الناس اليک ، فقال : يا محمّد ! فانبسطت .**

''میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ تھا، آپ کا پاؤں سن ہو گیا، میں نے عرض کی، اے ابو عبدالرحمٰن! آپ کے پاؤں کو کیا ہو گیا ہے؟ فرمایا، یہاں سے میرے پٹھے کھنچ گئے ہیں، میں نے عرض کی، تمام لوگوں میں سے جو ہستی آپ کو سب سے زیادہ محبوب ہے، اسے یاد کریں، آپ نے یا محمّد! کہا، اسی وقت ان کے پٹھے کھل گئے۔'' (الادب المفرد للبخاری : ۹۲٤ ، مسند علی بن الجعد : ۲۵۳۹، عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی : ۱۷۳ ، طبقات ابن سعد : ۱۵٤/٤، تاریخ ابن معین : ۲۹۵۳)

تبصرہ : اس کی سند ''ضعیف'' ہے، اس کی سند کا دارومدار ابو اسحاق السبیعی پر ہے جو کہ ''مدلس'' اور ''مختلط'' ہیں، مسلّم اصول ہے کہ ثقہ مدلس جب بخاری ومسلم کے علاوہ ''عن'' یا ''قال'' سے بیان کرے تو راویت ''ضعیف'' ہوتی ہے، جب تک سماع کی تصریح نہ کرے، اس کی صحت کے مدعی پر سماع کی تصریح لازم ہے۔

الادب المفرد کی سند میں سفیان ثوری رحمہ اللہ ''مدلس'' ہیں، جو کہ ''عن'' سے بیان کر رہے ہیں۔

عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی (۱۶۹) میں سفیان ثوری رحمہ اللہ کی ابو بکر بن عیاش (۱۷۱)، اسرائیل بن یونس اور (۱۷۳) زہیر بن معاویہ نے متابعت کر رکھی ہے۔

یہ تینوں ابو اسحاق سے اختلاط کے بعد روایت لیتے ہیں، لہٰذا یہ روایت ابو اسحاق السبیعی کی تدلیس وتخلیط کی وجہ سے ''ضعیف'' ہے، نہ معلوم عقیدہ میں خبرِ واحد کو حجت نہ ماننے والے اسے سینے سے کیوں لگائے بیٹھے ہیں؟

فائدہ : امامِ بریلویت احمد رضا خان بریلوی لکھتے ہیں: ''حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو نام پاک لے کر ندا کرنی ہمارے نزدیک بھی صحیح نہیں ہے۔'' (روحوں کی دنیا از احمد رضا خان : ۲٤۵)

نیز دیکھیں («جاء الحق» از احمد یار خان نعیمی بریلوی : ۱۷۳/۱ ، شانِ حبیب الرحمن از نعیمی : ۱۳۶، ۲۲۶)

دلیل نمبر ۱۹ : مجاہد رحمہ اللہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں:

حذرت رجل رجل عبد ابن عبّاس ، فقال ابن عبّاس : اذكر أحب النّاس اليک ، فقال :

محمّد صلی اللّٰه علیه وسلم ، فذهب خدره .

''سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھے کسی شخص کی ٹانگ سن ہوگئی تو انہوں نے اس سے فرمایا، لوگوں میں سے جو تمہیں سب سے زیادہ محبوب ہے، اس کو یاد کرو تو اس شخص نے یـا محـمّد! کہا، اس کے پاؤں کا سن ہوجانا جاتا رہا۔'' (عمل الیوم واللیلة لابن السنی : ۱۷۰)

تبصرہ : یہ موضوع (من گھڑت) روایت ہے، اس کی سند میں غیاث بن ابراہیم النخعی بالاتفاق کذاب (پرلے درجے کا جھوٹا)، خبیث اور وضاع (جھوٹی حدیثیں گھڑنے والا) ہے۔

دلیل نمبر ۲۰ : سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو اپنے گھر سے نماز کے لیے نکلے اور یہ دعا پڑھے تو اللہ تعالیٰ اپنے چہرے کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس کے لیے ستر ہزار فرشتے دعائے مغفرت کرتے ہیں:

اللّٰهم انّی أسألک بحقّ السّائلین علیک ، وأسألک بحقّ ممشای هذا .

''اے اللہ! میں دعا کرنے والوں کا جو آپ پر حق ہے، اس کے طفیل اور میرے اس چلنے کے طفیل سوال کرتا ہوں۔'' (سنن ابن ماجه : ۷۷۸)

تبصرہ : اس کی سند سخت ترین ''ضعیف'' ہے، اس کا راوی عطیہ بن سعد العوفی جمہور کے نزدیک ''ضعیف'' ہے، نیز ''مدلس'' بھی ہے، حافظ نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **ضعیف عند الجمهور .**

''جمہور کے نزدیک یہ راوی ضعیف ہے۔'' (تهذیب الاسماء واللغات للنووی : ۴۸/۱) حافظ عراقی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **ضعّفه الجمهور .** (طرح التثریب لابن العراقی : ۴۲/۳) حافظ ہیثمی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **والأکثر علی تضعیفه .** (مجمع الزوائد : ۱۰/ ۴۱۲) حافظ ابن الملقن رحمہ اللہ اسے ''ضعیف'' قرار دے کر لکھتے ہیں:

والجمهور علی تضعیفه . ''جمہور اس کی تضعیف کرتے ہیں۔'' (البدر المنیر لابن الملقن : ۴۶۳/۷)

امام ہشیم بن بشیر اور امام سفیان ثوری رحمہما اللہ نے اسے ''ضعیف'' قرار دیا ہے۔ (الجرح والتعدیل : ۳۸۳/۶)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **ضعیف الحدیث .** ''یہ ضعیف حدیث والا ہے۔''

امام ابوزرعہ الرازی نے اسے ''لیّن'' کہا ہے اور امام ابوحاتم الرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ضعیف الحدیث ، یکتب حدیثه . ''ضعیف الحدیث ہے، اس کی حدیث (متابعات وشواہد میں) لکھی جائے گی۔'' (الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم : ۳۸۳/۶) امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے ''ضعیف'' قرار دیا ہے

۔(سنن الدارقطنی : ۳۹/٤) نیز فرماتے ہیں کہ ''مضطرب الحدیث'' ہے۔(العلل للدارقطنی : ۲۹۱/٤) امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کان یحییٰ یتکلّم فی عطیّة . ''امام یحییٰ عطیہ پر کلام (جرح) کرتے تھے۔'' (التاریخ الکبیر للامام البخاری : ۸۳/٤) نیز فرماتے ہیں: کان یحییٰ لا یروی عن عطیة . ''امام یحییٰ عطیہ بن سعد العوفی سے روایت نہیں کرتے تھے۔'' (التاریخ الکبیر للامام البخاری : ۱۲۲/٥) امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ضعیف ، الّا أنّه یکتب حدیثه . ''یہ راوی ضعیف ہے، البتہ اس کی روایت (متابعات وشواہد) میں لکھی جائے گی۔'' (الکامل لابن عدی : ۳٦۹/٥ ، وسندهٗ حسن) امام نسائی رحمہ اللہ نے ''ضعیف'' کہا ہے۔(میزان الاعتدال : ۳ /۸۰) امام ابنِ عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وهو مع ضعفه یکتب حدیثه ، وکان یعدّ من شیعة الکوفة . ''ضعیف ہونے کے باوجود اس کی حدیث (متابعات وشواہد) میں لکھی جائے گی، اس کا شمار کوفہ کے شیعوں میں ہوتا ہے۔'' (الکامل فی ضعفاء الرجال لابن عدی : ۳۷۰/٥) امام ساجی رحمہ اللہ کہتے ہیں: لیس بحجّة . ''قابل حجت نہیں ہے۔'' (تهذیب التهذیب : ۲۰۲/۷) حافظ ابنِ حزم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ضعیف جدّا . ''سخت ضعیف ہے۔'' (المحلی لابن حزم : ۸٦/۱۱) حافظ نووی رحمہ اللہ نے بھی ''ضعیف'' کہا ہے۔(خلاصة الاحکام للنووی : ٥۷۲/۱) حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں: ضعیف الحدیث ، مشهور بالتّدلیس القبیح . ''یہ راوی ضعیف الحدیث اور بری تدلیس کے ساتھ مشہور ہے۔'' (طبقات المدلسین لابن حجر : ٥۰) حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اسے ''ضعیف'' لکھا ہے۔(میزان الاعتدال فی نقد الرجال للذهبی : ۸۰/۳) حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ بھی ''ضعیف'' قرار دیتے ہیں۔(تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر : ۸۹/٦ ، بتحقیق المهدی) لہٰذا امام عجلی، امام ابنِ سعد اور امام ترمذی رحمہم اللہ کا اسے ''ثقہ'' کہنا جمہور کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناقابلِ التفات ہے۔

تنبیہ : عمل الیوم واللیلة لابن السنی (۸٥) میں جو سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، اس کی سند سخت ترین ''ضعیف'' ہے، اس میں الوازع بن نافع العقیلی راوی ''متروک، کذاب ووضاع'' ہے۔

دلیل نمبر ۲۱ : سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

کانت یهود خیبر تقاتل غطفان ، فکلّما التقوا هزمت یهود خیبر ، فعاذت الیهود بهذا الدّعاء : اللّٰهمّ انّا نسألک بحقّ محمّد النّبیّ الأمّیّ الّذی وعدتّنا أن تخرجه لنا فی آخر الزّمان الّا نصرتنا علیهم ، قال : فکانوا اذا التقوا دعوا بهذا الدّعاء ، فهزموا غطفان ، فلمّا بعث النّبیّ

صلی الله علیه وسلم کفروا به ، فأنزل اللّٰه : وقد کانوا یسفتحون بک یا محمّد علی الکافرین .

''خیبر کے یہودی غطفان قبیلے سے برسرِ پیکار رہا کرتے تھے، جب بھی دونوں کا سامنا ہوتا یہودی شکست کھا جاتے، پھر یہودیوں نے اس دعا کے ذریعے پناہ مانگی، اے اللہ! ہم تجھ سے اُمّی نبی محمد ﷺ کے وسیلہ سے سوال کرتے ہیں، جنہیں تو نے آخری زمانہ میں ہمارے لیے بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہے، تو ان کے مقابلے میں ہماری مدد فرما، راوی کہتے ہیں کہ جب بھی وہ دشمن کے سامنے آئے، انہوں نے یہی دعا مانگی اور غطفان (قبیلہ) کو شکست دی، لیکن جب نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے تو انہوں نے آپ ﷺ کا انکار کر دیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس سے تو وہ خود اے محمد! آپ کے وسیلہ سے کافروں پر فتح پانے کی دعا کرتے تھے۔''

(المستدرك للحاكم : ٢٦٣/٢ ، ح : ٣٠٤٢ ، الشريعة للآجری : ٤٤٨ ، دلائل النبوة للبيهقی : ٧٦/٢)

تبصرہ : یہ روایت جھوٹ کا پلندہ ہے، جسے عبدالملک بن ہارون بن عنترہ نے تیار کیا ہے، اس کے بارے میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ''ضعیف الحدیث''، امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے ''کذاب''، جوزجانی نے ''دجال، کذاب''، امام ابو حاتم الرازی رحمہ اللہ نے ''متروک الحدیث، ذاہب الحدیث''، امام دارقطنی رحمہ اللہ نے ''ضعیف'' اور امام ابنِ حبان رحمہ اللہ نے ''یضع الحدیث'' (یہ احادیث گھڑتا تھا) جیسے الفاظ کہے ہیں، اس پر توثیق کا ادنیٰ سا کلمہ بھی ثابت نہیں۔

دلیل نمبر ٢٢ : سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: أوحی اللّٰه الی عیسی علیه السّلام : یا عیسیٰ ! آمن وأمر من أدرکه من أمّتک أن یؤمنوا به ، فلولا محمّد ما خلقت آدم ، ولولا محمّد ما خلقت الجنّة والنّار ، ولقد خلقت العرش علی الماء ، فاضطرب ، فکتب علیه : لا اله الّا اللّٰه محمّد رسول اللّٰه ، فسکن .

''اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی، اے عیسیٰ! محمد ﷺ پر ایمان لاؤ اور اپنی امت کو بھی حکم دو کہ ان میں سے جو ان کا زمانہ پائے، ان پر ایمان لائے، (جان لو!) اگر محمد نہ ہوتے تو میں آدم کو بھی پیدا نہ کرتا، اگر محمد نہ ہوتے تو میں جنت وجہنم کو پیدا نہ کرتا، جب میں نے پانی پر عرش بنایا تو اس میں لرزش پیدا ہوگئی، لہٰذا میں نے اس پر لا اله الّا اللّٰه محمّد رسول اللّٰه لکھ دیا تو وہ ٹھہر گیا۔''

(المستدرك للحاكم : ٦١٥/٢ ، ح : ٤٢٢٧ ، طبقات المحدثين باصبهان لابن حيان : ٢٨٧/٣)

تبصرہ : یہ موضوع (من گھڑت) قول ہے، جیسا کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وأظنّه موضوعا. ''میں اسے موضوع (من گھڑت) سمجھتا ہوں۔'' (میزان الاعتدال: ۲۴۶/۳، ت: ۶۳۳۰)

① اس کے راوی عمرو بن اوس انصاری کے بارے میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

يجهل حاله، أتىٰ بخبر منكر. ''اس کے حالات معلوم نہیں، اس نے ایک منکر خبر بیان کی ہے۔''
(میزان الاعتدال للذهبي: ۲۴۶/۳)

② اس میں سعید بن ابی عروبہ راوی ''مدلس ومختلط'' ہے۔ ③ قتادہ بن دعامہ تابعی ''مدلس'' ہیں اور ''عن'' کے ساتھ بیان کر رہے ہیں، لہٰذا امام حاکم رحمہ اللہ کا اس کی سند کو ''صحیح'' کہنا صحیح نہیں، بلکہ ان کا تساہل ہے، حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی تردید کر دی ہے، نیز یہ قول شرعی نصوص کے بھی خلاف ہے۔

دلیل نمبر ۲۳ : ''نبی کریم ﷺ فاطمہ بنتِ اسد کی قبر پر یوں دعا کی: **بحقّ نبيّك والأنبياء من قبلي ...** ''تیرے نبی اور مجھ سے پہلے انبیاء کے طفیل۔۔۔'' (المعجم الكبير للطبراني: ۳۵۱/۲۴، المعجم الاوسط: ۱۹۱، حلية الاولياء: ۱۲۱/۳)

تبصرہ : یہ ''ضعیف'' اور ''منکر'' روایت ہے، ① اس کا راوی روح بن صلاح جمہور کے نزدیک ''ضعیف'' ہے، امام ابن عدی نے اسے ''ضعیف'' کہا ہے۔ (الكامل لابن عدي: ۱۴۶/۳)

امام دارقطنی کہتے ہیں: **كان ضعيفا في الحديث.** (الموتلف والمختلف: ۱۳۷۷/۳)

ابن ماکولا کہتے ہیں: **ضعفوه.** ''(جمہور) محدثین اسے ضعیف کہتے ہیں۔'' (الاكمال: ۱۵/۵)

ابن یونس کہتے ہیں: **رويت عنه مناكير.** ''اس سے منکر روایات بیان کی گئی ہیں۔''
(لسان الميزان لابن حجر: ۴۶۷/۲) لہٰذا امام ابنِ حبان (الثقات: ۲۴۴/۸) اور امام حاکم (سوالات السجزي: ۹۸) کی توثیق تساہل پر محمول ہے۔ ② اس میں سفیان ثوری ''مدلس'' ہیں جو ''عن'' سے روایت کر رہے ہیں۔ اس کی صحت کے مدعی پر سماع کی تصریح لازم ہے۔

❀❀❀❀❀❀❀

تاریخی اعتراضات : قارئین! منکرِ حدیث صاحب نے صحیح بخاری کی اتفاقی طور پر صحیح احادیث پر دو تاریخی اعتراضات کیے ہیں، لیکن یہ اعتراضات بھی ان کے حدیث فہمی میں بری طرح فیل ہونے پر برہانِ عظیم ہیں، آیئے اس کا فیصلہ آپ ہی سے کرواتے ہیں:

اعتراض نمبر ① : ''بریرہ خادمہ رضی اللہ عنہا کا ذکر اس داستان میں اس کے سرتاپا جھوٹ ہونے کی واضح دلیل ہے، کیونکہ بریرہ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ کی آزاد کردہ کنیز تھی، ام المؤمنین نے اس کو فتح مکہ کے بعد خریدا اور آزاد فرما دیا تھا۔۔۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی اپنے اہل وعیال کے ساتھ فتح مکہ کے بعد ہی مدینہ میں منتقل ہوئے تھے۔۔۔الغرض بریرہ کا ام المومنین رضی اللہ عنہا کی خدمت میں رہنا یقیناً فتح مکہ کے بعد کی بات ہے اور حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا پر بہتان لگنے کا واقعہ غزوۂ بنی المصطلق کے بعد بتایا جاتا ہے، اس وقت تو بریرہ ام المومنین کی خدمت میں آئی ہی نہ تھیں، لامحالہ یہ غلط ہے، آزادی کے بعد ہی بریرہ کو خیارِ عتق (آزادی کے بعد لونڈی کو غلام خاوند کے ساتھ رہنے یا نہ رہنے کا اختیار) حاصل ہوا ہے، تب ہی اس کے شوہر کو بے تابی لاحق ہوئی ہے اور ان دونوں کا متضاد حال دیکھ کر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کہا:

ألا تعجب من حبّ مغيث بريرة ، ومن بغض بريرة مغيثاً . (کیا آپ بریرہ سے مغیث کی محبت اور بریرہ کی مغیث سے نفرت پر تعجب نہیں کرتے؟)

اور تبھی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بچشمِ خود مغیث کا بریرہ کے پیچھے روتے ہوئے پھرنا دیکھا ہے۔

اور تمام محدثین ومؤرخین قطعاً اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت عباس اور ان کے اہل وعیال فتح مکہ کے بعد ہی مدینہ منتقل ہوئے ہیں، اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ اس داستان میں بریرہ کا ذکر قطعاً غلط ہے اور یہ غلط حضرت ام المومنین کی بیان کردہ نہیں ہے، یقیناً یہ غپ شپ کچھ لوگوں نے وضع کر کے ام المومنین کی طرف منسوب کر دی ہے، اس داستان کے مصنف کو یہ تو معلوم تھا کہ بریرہ نام کی ایک باندی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر حضرت عائشہ کی خدمت میں رہتی تھی، مگر اسے بحمد اللہ اس کا پتہ نہ تھا کہ وہ کس سنہ میں اور کب ام المومنین کی خدمت میں آئی تھی، پس افسانہ مکمل کرنے کے لیے اس نے اس میں بریرہ کا اور اس سے پوچھ گچھ کیے جانے کا ذکر تراش کر پیوند کر دیا۔ اگر اسے یہ بات معلوم ہوتی تو وہ اس کا ذکر ہی نہ کرتا، حیرت اس پر ہے کہ محققین حتی کہ امام بخاری رحمہ اللہ جیسے حضرات کو بھی اس پر تنبہ نہ ہوا۔'' («صحیح بخاری کا مطالعہ»: ۱/۱۵۶۔۱۵۸)

جواب : ① جناب نے یہ اعتراض کر کے اپنی عقل اور اپنے علم دونوں کا جنازہ اکٹھا ہی نکال دیا ہے، عقل کا تو اس طرح کہ وہ خود لکھ چکے ہیں کہ ''پس بے شک عروہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان لگنے والی داستان سنی تھی۔۔۔۔'' («صحیح بخاری کا مطالعہ» : ۱/۱۷۷)

قارئین کرام! ان کی عقل تو ٹھکانے آنے سے رہی، اللہ کے لیے آپ ہی سوچیں کہ اس حدیث میں بریرہ رضی اللہ عنہا کے تذکرے کا صحیح یا غلط ہونا اس دور کے لوگوں کو زیادہ معلوم تھا یا ''دروغ گو را حافظہ نہ باشد'' کی عملی تصویر بن کر چودہ سو سال بعد آنے والے شخص کو؟ اگر یہ غلط ہوتا تو کیا عروہ رحمہ اللہ جو کہ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے تھے ،ان کو اور اسی طرح دوسرے تمام راویوں کو یہ معلوم نہ ہوتا؟ یقیناً یہ اعتراض کوئی عقل سے پیدل شخص ہی کر سکتا ہے۔

② جہاں تک علم کا تعلق ہے تو وہ ان کے قریب سے بھی نہیں گزرا، کیونکہ خود محدثین کرام نے حدیثِ افک کے بارے میں بعض لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونے والے اس اشکال کا ازالہ کر کے وضاحت کر دی ہے، کاش حضرت صاحب صحیح بخاری کو سمجھنے کی کوشش کرتے ،لیکن جب آدمی کے قلب و ذہن میں انکارِ حدیث کا فتور ڈیرا ڈال لے تو پھر وہاں فہم حدیث کو کب جگہ ملتی ہے؟

❁ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **وقد قيل انّ تسميتها هنا وهم ، لأنّ قصّتها كانت بعد فتح مكة ......وقد أجاب غيره بأنّها كانت تخدم عائشة بالأجرة ، وهي في رقّ مواليها قبل وقوع قصّتها في المكاتبة .**

''(اعتراض کرتے ہوئے یہ) کہا گیا ہے کہ اس حدیث میں اس (بریرہ) کا نام لینا (راوی کا) وہم ہے، کیونکہ اس کا (آزادی والا) قصہ فتح مکہ کے بعد کا ہے۔۔۔ بلاشبہ ان کے علاوہ (دوسرے محدثین) نے (اس اعتراض کا) یہ جواب دیا ہے کہ بریرہ رضی اللہ عنہا اپنے مکاتبت والے قصہ کے رونما ہونے سے پہلے، جبکہ ابھی اپنے مالکوں کی غلامی میں تھیں، اجرت پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت کرتی تھیں۔'' (فتح الباري : ٨/٤٦٩)

معلوم ہوا کہ محدثین نے صدیوں پہلے اس اعتراض کا جواب دے دیا تھا، لیکن منکرینِ حدیث نے اپنی جہالتِ مطلقہ کا پورا پورا ثبوت دیتے ہوئے اس کو دہرایا ہے، لہٰذا ان کو امام بخاری رحمہ اللہ پر حیرت کرنے کی بجائے اپنی بے عقلی ولاعلمی پر حیرت کرنی چاہیے۔

جن علمائے امت نے اس اشکال کو دور کیا ہے، ان میں سے چند ایک کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

❁ علامہ تقی الدین سبکی (۶۸۳-۷۵۶ھ) فرماتے ہیں: انھا کانت تخدم عائشة قبل شرائها.

''وہ (بریرہ رضی اللہ عنہا) ان (سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا) کے خریدنے سے پہلے ان کی خدمت کرتی تھیں۔'' (فتح الباری: ۴۰۹/۹)

❁ علامہ محمد بن عبدالباقی الزرقانی (م۱۱۲۲ھ) لکھتے ہیں: وکانت تخدم عائشة قبل أن تعتق، کما فی حدیث الافک. ''وہ (بریرہ رضی اللہ عنہا) آزادی پانے سے پہلے ہی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں رہتی تھیں، جیسا کہ حدیثِ افک میں (ان کا ذکر موجود) ہے۔'' (شرح الزرقانی علی الموطأ: ۱۱۲/۴)

❁ خود حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وکانت تخدم عائشة قبل أن تعتق.

''وہ (بریرہ رضی اللہ عنہا) آزاد ہونے سے پہلے ہی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت کرتی تھیں۔'' (فتح الباری: ۱۸۸/۵)

❁ ملا علی قاری حنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وأمّا ذکرها فی قصّة الافک مع تقدّمها فوجّه بأنّها کانت تخدم عائشة قبل شرائها.... ''رہا ان (بریرہ رضی اللہ عنہا) کا واقعہ افک میں ذکر آنا، حالانکہ وہ واقعہ پہلے رونما ہو چکا تھا تو اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ بریرہ رضی اللہ عنہا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے خریدنے سے پہلے بھی ان کی خدمت میں رہتی تھیں۔'' (مرقاۃ المفاتیح: ۱۳۹/۱۰)

❁ علامہ محمد عبدالرحمٰن مبارکپوری (تحفۃ الاحوذی: ۳۹۰/۴)، علامہ عبیداللہ مبارکپوری (مرعاۃ المفاتیح: ۲۱۸/۶) وغیرہما رحمہما اللہ نے بھی یہی جواب ذکر کر کے صحیح بخاری کی حدیثِ افک کا دفاع کیا ہے۔

اب قارئین ہی فیصلہ فرمائیں کہ بتصریحِ محدثین خادمہ بریرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ افک میں تذکرہ اس حدیث کی صحت میں کوئی شبہ پیدا نہیں کرتا، بلکہ منکرینِ حدیث کا یہ اعتراض خود ان کے علم و عقل پر زبردست طمانچہ ہے جو قیامت تک ان کی رسوائی کا باعث بنتا رہے گا، کیونکہ بریرہ رضی اللہ عنہا کو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بعد میں آزاد کرنا عقلِ سلیم کے مطابق اس بات کے بالکل منافی نہیں ہے کہ وہ پہلے بھی آپ رضی اللہ عنہا کی خدمت کرتی ہوں۔

اعتراض نمبر ② : ''اس داستان میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا ذکر ہونا اس کے قطعی جھوٹ ہونے کی نہایت واضح و قطعی دلیل ہے، اس لیے کہ تمام مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ غزوۂ بنی مصطلق جسے غزوۃ المریسیع بھی کہا جاتا ہے، غزوۂ احزاب کے تقریباً نو ماہ بعد ہوا ہے۔۔۔۔اور زہری کی داستان میں یہ ہے کہ حضرت ام المؤمنین پر افک و بہتان لگنے کا قصہ غزوۂ بنی مصطلق سے واپسی میں پیش آیا تھا۔۔۔اسی پر تمام مؤرخین نے اعتماد کیا ہے اور ناظرین کو معلوم ہوگا اور معلوم نہیں ہے تو ہو جانا چاہیے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ غزوۂ بنی مصطلق کے وقت اس عالم میں تھے ہی نہیں، کیونکہ ان کی وفات غزوۂ

احزاب سے تقریباً چالیس دن بعد ہوئی ہے، جنگِ احزاب میں ان کی رگِ اکحل میں کسی مشرک کا تیر لگ گیا تھا۔۔۔بنی قریظہ کی مہم ختم ہوتے ہی رات کو زخم کا منہ کھل گیا اور جسم سے خون نچڑ نچڑ کر بہہ گیا اور وفات ہوگئی۔

اس پر تمام مؤرخین کا اتفاق ہے، خود ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی وفات کا پورا قصہ بیان کیا ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کی تین جگہ تخریج فرمائی ہے۔۔۔جب کہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے بنی قریظہ کے بعد متصلاً وفات پائی ہے تو خود وہی کیسے یہ بیان کرسکتی تھیں کہ نو دس ماہ بعد سعد بن معاذ نے مسجد کے اندر بھرے مجمع میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا۔۔۔؟ یہ اشکال نہایت واضح ہے اور سخت حیرت ہے کہ محقق محدثین و مؤرخین حتی کہ امام بخاری جیسے شخص کا ذہن بھی اس کی طرف ملتفت نہ ہوا۔۔۔'' (««صحیح بخاری کا مطالعہ»» : ١/١٦٠_١٦٢)

جواب : ① جھوٹ کے رسیا منکرِ حدیث صاحب حدیثِ رسول کو (معاذ اللہ) جھوٹ ثابت کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لے رہے ہیں، ان کا یہ کہنا کہ تمام مؤرخین غزوۂ بنی المصطلق کے غزوۂ احزاب کے بعد رونما ہونے پر متفق ہیں، ایسا کالا جھوٹ ہے، جیسا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٔ نبوت، کیونکہ:

❁ امام موسیٰ بن عقبہ رحمہ اللہ (م ١٤١ھ) کے بقول غزوۂ بنی المصطلق غزوۂ احزاب سے پہلے کا ہے۔

(تغلیق التعلیق لابن حجر : ١٢٣/٤، وسندهٗ حسن)

❁ مغازی کے ماہر ابو معشر المدنی (م ١٧٠ھ) نے غزوۂ بنی المصطلق کو پہلے اور غزوۂ احزاب کو بعد میں ذکر کیا ہے۔ (فتح الباری لابن حجر : ٤٣٠/٧)

❁ امام محمد بن مسلم بن شہاب زہری رحمہ اللہ (م ھ) فرماتے ہیں: **ثم قاتل بني المصطلق وبني لحيان في شعبان سنة خمس .** ''پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو مصطلق اور بنو لحیان سے شعبان پانچ ہجری میں قتال فرمایا۔'' (السنن الکبری للبیہقی : ٥٤/٩، وسندهٗ حسنٌ)

غزوۂ احزاب شوال میں ہوا ہے، لہٰذا امام زہری رحمہ اللہ کے نزدیک غزوۂ بنی المصطلق لامحالہ پہلے ہوا ہے، کیونکہ وہ اسی سال کے ماہِ شعبان میں ہوا ہے۔

❁ امام اسماعیل بن اسحاق القاضی رحمہ اللہ (م ٢٨٢ھ) فرماتے ہیں: **اختلفوا في ذلک ، والأولى أن تكون المريسيع قبل الخندق ، وعلى هذا فلا اشكال ...** ''لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے، زیادہ بہتر یہی ہے کہ غزوۂ مریسیع کو غزوۂ احزاب سے پہلے سمجھا جائے، اس طرح کوئی اشکال

باقی نہیں رہتا۔'' (شرح مسلم للنووی: ٥٣٥/٥، زاد المعاد لابن القیم: ١٢٨/٢، فتح الباری: ٤٧٢/٨)

❁ علامہ ابن قیّم رحمہ اللہ (٦٩١۔٧٥١ھ) نے بھی پہلے غزوۂ مریسیع کو اور بعد میں غزوۂ احزاب کو ذکر کیا ہے۔(دیکھیں زاد المعاد لابن القیم)

❁ مؤرخِ اسلام علامہ ذہبی رحمہ اللہ (٦٧٣۔٧٤٨ھ) نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب تاریخِ اسلام میں غزوۂ مریسیع کو پہلے اور غزوۂ احزاب کو بعد میں ذکر کیا ہے۔

❁ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **فیظهر أنّ المريسيع كانت في سنة خمس في شعبان لتكون قد وقعت قبل الخندق ، لأنّ الخندق كانت في شوّال من سنة خمس أيضا فتكون بعدها .**

''(ان دلائل سے) ظاہر ہوتا ہے کہ غزوۂ مریسیع شعبان پانچ ہجری میں ہوا تھا، لہٰذا یہ غزوۂ خندق سے پہلے رونما ہوا ہے، کیونکہ غزوۂ خندق پانچ ہجری ہی کے شوال میں ہوا تھا، چنانچہ احزاب بعد میں ہے۔'' (فتح الباری: ٤٣٠/٧)

❁ عالمِ عرب کے مشہور عالم شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **لأنّ غزوة الخندق كانت في شوّال في السّنة الخامسة ......** ''بلاشبہ غزوۂ خندق شوال پانچ ہجری میں ہی پیش آیا تھا۔''

(شرح بلوغ المرام للشيخ العثيمين: ٢٩٨/٥)

لہٰذا ان کے نزدیک بھی غزوۂ احزاب بعد میں اور مریسیع کا واقعہ پہلے پیش آیا ہے۔

❁ موجودہ دور میں عالمِ عرب کے معروف ومحقق مؤرخ محمد الغزالی لکھتے ہیں: **وكتاب السّيرة على أنّ حديث الافك وغزوة بني المصطلق كانا بعد الخندق ، لكنّنا تابعنا ابن القيم في اعتبارها من حوادث السّنة الخامسة قبل هجوم الأحزاب على المدينة ، والتّحقيق يساند ابن القيم ومتابعيه ....** ''سیرت کی کتاب میں یہ ہے کہ واقعۂ افک اور غزوۂ بنی المصطلق غزوۂ خندق (احزاب) کے بعد ہوئے تھے، لیکن ہم نے حافظ ابن قیّم رحمہ اللہ کی پیروی کرتے ہوئے اسے پانچویں ہجری میں غزوۂ احزاب سے پہلے شمار کیا ہے اور تحقیق (بھی) حافظ ابن قیّم اور ان کے پیروکاروں کے موقف کی تائید کرتی ہے۔۔۔'' (فقه السيرة لمحمد الغزالي: ٣١٦)

❁ عصرِ حاضر کے ایک اور مؤرخ محمد الخضری نے بھی غزوۂ بنی المصطلق کو غزوۂ احزاب سے پہلے کا واقعہ قرار دیا ہے۔(نور اليقين في سيرة سيد المرسلين لمحمد الخضري: ١٥٢)

❁ اردو اور عربی زبان میں معروف کتابِ سیرت ''الرحیق المختوم'' کے مصنف مولانا صفی الرحمٰن

مبارکپوری رحمہ اللہ نے بھی دلائل کے لحاظ سے راجح اسی بات کو قرار دیا ہے کہ غزوۂ مریسیع کو غزوۂ احزاب سے مقدم کہا جائے۔(الرحیق المختوم اردو : ٤٤٢۔٤٤٣)

مذکورہ مؤرخین کے علاوہ بھی بہت سے متقدمین مؤرخین، مثلا ابوعبداللہ محمد بن عمر الواقدی (م ۲۰۷ھ) (مغازی الواقدی : ٤٠٤/١)، **محمد بن سعد بن منیع المعروف ابنِ سعد (۱۶۸۔۲۳۰ھ)** (طبقات ابن سعد : ٦٣/٢)، **بلاذری** (انساب قریش للبلاذری : ٣٤١،٣٤٣)، **نیز متاخرین، مثلاً ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی** (فقہ السیرۃ للبوطی : ٩٣/٢)، **ڈاکٹر محمد بن محمد ابو شہبہ** (السیرۃ النبویۃ فی ضوء القرآن والسنۃ : ١٩٦)، **حسن الساعاتی** (الفتح الربانی فی ترتیب مسند احمد : ١٠٩/١٤) **اور الصابونی** (روائع البیان فی تفسیر آیات الاحکام للصابونی : ١١٩/٢) وغیرہ نے بھی غزوۂ بنی المصطلق کو شعبان پانچویں ہجری میں بتایا ہے اور ان کے نزدیک غزوۂ خندق پانچویں ہجری ہی کے ماہِ شوال میں پیش آیا تھا، لہٰذا بدیہی بات ہے کہ ان کے نزدیک غزوۂ مریسیع پہلے پیش آیا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی یاد رہے کہ جن مؤرخین نے غزوۂ مریسیع کو چار ہجری کے واقعات میں شمار کیا ہے، بلاشبہ ان کے نزدیک بھی غزوۂ احزاب اس کے بعد ہی پیش آیا ہے، ان میں سے مشہور یہ ہیں:

ابوالحسن علی بن الحسین بن علی المسعودی (م ۳۴۶ھ) (مروج الذھب : ٢٩٥/٢)، **محمد بن عبداللہ بن محمد المعافری ابوبکر ابن العربی المالکی (۴۶۸۔۵۴۳ھ)** (عارضۃ الاحوذی شری جامع الترمذی : ١٧٣/٧)

ثابت ہوا کہ غزوۂ بنی المصطلق کے غزوۂ احزاب کے بعد ہونے پر اتفاق کا دعوی منکرینِ حدیث کا بدترین جھوٹ ہے، شاید انہوں نے جھوٹ کا عالمی ریکارڈ توڑنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بارے میں مؤرخین کی آراء مختلف ہیں اور دلائل کی رو سے راجح بات یہی ہے کہ غزوۂ بنی المصطلق کا واقعہ غزوۂ احزاب سے پہلے کا ہے، کیونکہ قدیم وجدید مؤرخین میں سے محققین نے اسی کو حق وصواب قرار دیا ہے، نیز صحیح بخاری کی صحت پر عموماً اور حدیثِ افک کی صحیح ہونے پر خصوصاً امت کا جو اجماع ہے، وہ اسی موقف کی تائید کرتا ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور دیگر علمائے امت نے صراحت کر دی ہے۔

رہا غزوۂ بنی المصطلق کو پہلے قرار دینے پر یہ اشکال پیش کرنا کہ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آنے اور پردے کی آیات نازل ہونے کے واقعات غزوۂ احزاب کے بعد کے ہیں، پھر ان کا ذکر حدیثِ افک میں کیسے آ گیا؟ تو منکرینِ حدیث کا یہ اشکال بھی سابقہ اعتراض کی طرح محض ایک مغالطہ ہی ہے، کیونکہ پردے کی آیات کے نزول اور پھر سیدہ زینب رضی اللہ عنہا سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کا واقعہ بھی راجح

مؤقف کے مطابق تین یا چار ہجری میں غزوۂ مریسیع سے پہلے پیش آیا تھا، جیسا کہ ابوعمرو خلیفہ بن خیاط العصفری (م ۲۴۰ھ) (تاریخ خلیفة)، ابوعبیدہ معمر بن مثنّیٰ (۱۱۲-۲۰۸ھ) (الاستیعاب فی معرفة الاصحاب لابن عبد البر: ۹۷/۲، اسد الغابة فی معرفه الصحابة لابن الاثیر: ۳۵۷/۳) وغیرہ کے نزدیک یہ واقعات تین ہجری کے ہیں، جبکہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ اور حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ وغیرہ چار ہجری میں بتاتے ہیں۔

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **والحجاب كان فى ذى القعدة سنة أربع عند جماعة ، فيكون المريسيع بعد ذلك ...** ''(نزولِ) حجاب (پردہ کا واقعہ) بہت سے مؤرخین کے ہاں ذوالقعدہ چار ہجری کا ہے، یوں یہ غزوۂ مریسیع کے بعد پیش آیا ہے۔۔۔''

نیز لکھتے ہیں: **فحصّلنا فى الحجاب على ثلاثة أقوال أشهرها سنة أربع ....**

''چنانچہ ہمیں نزولِ حجاب کے بارے میں تین اقوال ملے ہیں، ان میں سے زیادہ مشہور قول چار سنِ ہجری کا ہے۔۔۔۔'' (فتح البارى لابن حجر: ٤٣٠/٧)

اس کے برعکس پانچ ہجری میں غزوۂ احزاب کے بعد نزولِ حجاب والے قول کے بارے میں فرماتے ہیں: **وأمّا قول الواقدىّ : أنّ الحجاب كان فى ذى القعدة سنة خمس ، فمردود ....**

''رہا واقدی کا یہ کہنا کہ پردے کا حکم ذوالقعدہ پانچویں ہجری میں آیا تھا تو یہ مردود ہے (کیونکہ خود واقدی نے ہی لکھا ہے کہ غزوۂ مریسیع شعبان پانچ ہجری کا واقعہ ہے، نیز اس غزوے میں انہوں نے واقعہ افک کا بھی تذکرہ کیا ہے اور اس میں موجود ہے کہ اس سے پہلے ہی پردے کا حکم نازل ہو چکا تھا، پھر واقدی کا واقعہ افک کے دو تین ماہ بعد پردے کے نزول کی تاریخ بتانا واضح تناقض ہے)۔'' (فتح البارى: ٤٣٠/٧)

اب قارئین ہی بتائیں کہ منکرِ حدیث صاحب کا یہ کہنا کہاں تک درست ہے؟

''دیگر اہل علم بھی یہی بتاتے ہیں اور یہی حقیقت بھی ہے کہ حضرت زینب غزوۂ احزاب کے بعد ہی امہات المؤمنین میں داخل ہوئی ہیں۔۔۔۔'' («صحيح بخاری کا مطالعه» : ١٦٤/١)

❁ کیا منکرینِ حدیث کو سارے محدثین و محققین مؤرخین کو چھوڑ کر واقدی جیسا ''کذاب'' اور جھوٹا شخص ہی ''اہل علم'' نظر آیا ہے اور سب کو پسِ پشت ڈال کر اسی جھوٹے کی متناقض اور غیر حقیقت بات ہی ''حقیقت'' محسوس ہوئی ہے، جسے یہ بھی پتا نہیں چلا کہ میں پہلے کیا کہہ آیا ہوں اور بعد میں کیا کہہ رہا ہوں؟ نیز یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے کہ ''دیگر اہل علم بھی یہی بتاتے ہیں''، حالانکہ قارئین حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ کی زبانی یہ معلوم کر

چکے ہیں کہ اکثر علمائے کرام کا موقف ''یہی'' ہے کہ پردے کا حکم غزوۂ احزاب سے پہلے کا ہے۔

اعتراض کرتے ہیں امت کے اجماعی فیصلے صحیح بخاری پر اور بنیاد بناتے ہیں جھوٹ کو، یہ دیکھ کر بے ساختہ شعر یاد آ گیا ہے: ع اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔

عقلی اعتراضات

اعتراض نمبر ① : ''جب ام المؤمنین قضائے حاجت کے لیے گئی تھیں تو حضور ﷺ کو اس کا علم کیسے نہ ہوا؟ ظاہر ہے کہ وہ آپ کے ساتھ اور آپ کے پاس ہی تو تھیں ۔۔۔۔ بہر کیف حضرت عائشہ کے جنگل جانے اور واپس نہ آنے سے حضورِ اکرم ﷺ کا بے خبر رہ جانا قطعاً سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔'' («صحیح بخاری کا مطالعہ» : ۱۴۸/۱)

جواب : ① قارئین کرام! اگر کسی نیم پاگل کی عقل و سمجھ دو اور دو کے چار ہونے کا انکار کر دے تو کیا اس حقیقت کا انکار کر دیا جائے گا؟ قطعاً نہیں، بفضل اللہ اس حدیث کی سند و متن پر واقع ہونے والے اصولی و تاریخی اعتراضات کے شافی و کافی جوابات دے کر ہم نے اس کی صحت کو ثابت کر دیا ہے، اب بھی اگر کوئی ہٹ دھرمی اختیار کر لے اور میں نہ مانوں کا مصداق بن کر حدیثِ رسول کی قبولیت کے لیے اپنی عقلِ نارسا کو معیار قرار دینے کی سعی کرے تو یہ اس کی بدبختی ہے، ہم ایسے بدبختوں سے سوال کرتے ہیں کہ قرآنِ کریم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ ایک آدمی اگر ایسا ہی اعتراض قرآنِ کریم پر کر دے، مثلاً فرمانِ باری تعالیٰ:

﴿ فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴾(سبا : ۱۴)

''جب ہم نے ان (سلیمان علیہ السلام) پر موت کا فیصلہ کیا تو ان (جنوں) کو ان کی موت کی خبر اس زمینی کیڑے (دیمک) نے دی جو ان کی لاٹھی کھا رہا تھا، جب آپ علیہ السلام گر پڑے تو جنوں کی حقیقت واضح ہو گئی کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس رسوا کن عذاب میں نہ پڑے رہتے۔''

اس کے بارے میں وہ یہ تبصرہ کرے: ''یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنا عرصہ سلیمان علیہ السلام بے حس و حرکت کھڑے رہے، لیکن جنوں کو پتا ہی نہ چلا کہ وہ فوت ہو گئے ہیں، حالانکہ اپنی زندگی میں آپ علیہ السلام ہر وقت اور ہر کام میں ان کو مناسب احکام دیتے رہتے تھے، نیز سستی کرنے والے کو سزا بھی دیتے

تھے، اگر ایک دو دن آپ نے کوئی حرکت نہ کی تھی تو جنوں کو معلوم ہو جانا چاہیے تھا کہ کوئی نہ کوئی مسئلہ ہے، وہ بہانے سے قریب آ کر ہی دیکھ لیتے کہ کیا ماجرا ہے، جنوں کی تیز اور شرارتی طبیعت سے کون واقف نہیں؟ کیا اتنے عرصے میں کسی جن نے کوئی غلطی نہ کی تھی؟ پھر دیمک کے لاٹھی کو چاٹنے اور آپ کے گرنے تک کے دورانیے میں جنوں کو معلوم نہ ہونا عقل سے بالاتر ہے۔۔۔''

تو اس کا منکرینِ حدیث کے پاس کیا جواب ہے؟ جو جواب وہ منکرینِ قرآن کو دیں گے، وہی جواب ہم ان کو حدیثِ افک پر اس اعتراض کا دے دیں گے۔

(۲) اسی حدیث کو ہی اگر غور سے پڑھ لیا جاتا تو یہ اعتراض کرنے کی نوبت نہ آتی، کیونکہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں: **فكنت أحمل في هودجي وأنزل فيه .**

''میں اپنے ہودج (اونٹ پر رکھی جانے والی چھت دار کاٹھی) میں ہی سوار کی جاتی اور اٹھائی جاتی تھی۔''

عربوں میں رواج تھا کہ عورتوں کے لیے اونٹ کے اوپر رکھی جانے والی کاٹھی کمرہ نما بناتے تھے، لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گمان یہ تھا کہ آپ رضی اللہ عنہا اپنے اس کمرے میں چلی گئی ہیں، اسی لیے آپ نے پورے راستے میں بھی خیال نہیں فرمایا، اتنی سی بات منکرینِ حدیث کی عقلِ ناقص سمجھ نہیں پائی اور انہوں نے امت کے اجماعی فیصلے صحیح بخاری کو ٹھکرا دیا ہے۔

انکارِ حدیث سے انکارِ قرآن تک : یاد رہے کہ اس بے ہودہ عقل کا حدیثِ نبوی میں استعمال صرف انکارِ حدیث تک نہیں، بلکہ انکارِ قرآن تک بھی پہنچا دیتا ہے، جیسا کہ منکرِ حدیث صاحب صحیح بخاری کی ایک حدیث پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عبیداللہ کی روایت میں ہے کہ اہل مکہ نے کہا تھا، **لو نعلم أنك رسول الله ...** **لو نعلم** عربیت کے لحاظ غلط ہے، صحیح لفظ **لو علمنا** ہے۔'' (((صحیح بخاری کا مطالعہ)) : ۷۳/۱)

غور کریں کہ منکرِ حدیث نے انکارِ حدیث کے جوش میں ہوش کھو کر قرآنِ کریم کا بھی انکار کر دیا ہے، کیونکہ بالکل یہی الفاظ **لو نعلم** قرآنِ کریم (آل عمران : ۱٦۷) میں بھی موجود ہیں، معاذ اللہ منکرینِ حدیث اللہ تعالیٰ کی کلام کو عربیت کے لحاظ سے غلط قرار دے کر کفر کے مرتکب ہو چکے ہیں، اس بات سے ہر عقل مند انسان بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ انکارِ حدیث دراصل انکارِ قرآن ہے۔

یہی منکرِ حدیث صاحب صحیح بخاری کی اجماعی طور پر صحیح تفسیری روایات کو غلط قرار دے کر جابجا اپنی تفسیر

''مفتاح القرآن'' کے مطالعہ کی دعوت دیتے رہتے ہیں، قارئین کرام اتنی سی مثال سے ہی ان کی عربی دانی، قرآن فہمی اور تفسیری صلاحیت کا اندازہ کر سکتے ہیں، نیز ان کی طرف سے امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ پر قرآن فہمی کے حوالے سے کی گئی اس بکواس کی حیثیت بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ: ''رہے زہری سے لے کر بخاری وغیرہ تک اسے روایت کرنے والے محدثین تو ان غریبوں کو بس شیخ سے سنی ہوئی سندیں اور حدیثیں یاد کر لینے، لکھ لینے اور پھر روایت کرنے کے مشغلہ نے اتنی فرصت ہی نہ دی تھی کہ قرآن کو سمجھ بوجھ کر پڑھتے ۔۔۔ کیا یہ غضب کی بات نہیں کہ تمام حفاظِ قرآن جانتے ہیں اور تمام مصاحف میں لکھا اور چھپا ہوا ہے ۔۔۔'' («صحیح بخاری کا مطالعہ» : ۳۰۵/۲)

قارئین کرام انصاف سے فیصلہ فرمائیں کہ انکارِ حدیث نے منکرینِ حدیث کو قرآن سمجھ بوجھ کر پڑھنے کی فرصت نہیں دی یا اہتمامِ حدیث نے محدثین کو فرصت نہیں دی؟ کیا یہ غضب کی بات نہیں ہے کہ **لو نعلم** تمام حفاظ کو یاد ہے اور تمام مصاحف میں لکھا اور چھپا ہوا ہے، پھر بھی منکرینِ حدیث اسے عربیت کے لحاظ سے غلط قرار دے رہے ہیں، نہ معلوم ان کا قرآن کونسا ہے؟ (معاذ اللہ!) جس میں یہ ''غلطی'' نہیں ہے؟

محدثین اور اسلافِ امت کے خلاف زبان درازی کرنے والے بد باطن شخص کو اللہ تعالیٰ اسی طرح رسوا فرماتے ہیں؟ لہٰذا صحیح بخاری پر یہ اعتراض رہتی دنیا تک منکرینِ حدیث کے ماتھے میں کلنک کا ٹیکا ہے، جسے دیکھ کر قیامت تک آنے والے لوگ ان کی بے وقوفی کی داد دیتے رہیں گے۔ ان شاء اللہ!

تُف ہے اس شخص پر جو ایسے جاہل مطلق اور محرّفِ قرآن کو ''مفسّر قرآن'' کے لقب سے نوازتا ہے۔

اعتراض نمبر ② : ''مدینہ منورہ میں جب تک گھروں میں پاخانے تعمیر نہیں کیے گئے تھے، عورتیں رات کے وقت قریبی جنگل میں قضائے حاجت کے لیے جایا کرتی تھیں، ازواجِ مطہرات بھی جاتی تھیں، مگر تنہا نہیں، ساتھ میں کوئی خادمہ ضرور ہوتی تھی ۔۔۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ام المؤمنین کے علاوہ لشکرِ اسلام میں کوئی عورت نہیں تھی یا تھیں، لیکن آپ کی قیام گاہ سے دور تھیں تو طبعاً ام المؤمنین خود حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے ساتھ چلنے کو کہتیں، ان کا اندھیری رات میں پڑاؤ سے تنہا باہر جانا بعید از امکان ہے ۔۔۔''

(«صحیح بخاری کا مطالعہ» : ۱۴۸/۱-۱۴۹)

جواب : ① قرآنِ کریم میں سیدہ مریم علیہا السلام کا قصہ مذکور ہے کہ جب ان کو ایک حاجت پیش آئی تو وہ اکیلی قوم سے دور چلی گئیں، پھر اکیلی واپس آئیں، اگر مریم علیہا السلام کا اکیلے چلے جانا کسی منکرِ قرآن کی عقل میں نہ آئے اور وہ اسے ناممکن قرار دے کر قرآن کا انکار کر دے تو منکرینِ حدیث کے پاس اس کا کیا

جواب ہے؟ اگر یہ قرآنی واقعہ منکرینِ حدیث کو ہضم ہو جاتا ہے تو بھلا حدیثِ نبوی کی صورت میں اسی قرآن کی تشریح و توضیح ہی آخر ان کے حلق میں کیوں اٹکتی ہے؟

④ مدینہ میں رہتے ہوئے جب قضائے حاجت کے لیے عورتیں جاتی تھیں تو انہیں باہر جنگل میں جانا پڑتا تھا اور جنگل دور ہوتا تھا، اس لیے کچھ عورتیں مل کر نکلتی تھیں، جبکہ اس حدیث کے مطابق سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اتنی دور گئی ہی نہیں تھیں کہ ساتھ کسی کو لے کر جانے کی ضرورت محسوس ہوئی، کیونکہ لشکر کا پڑاؤ جنگل میں ہی ہوا تھا اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا زیادہ دور گئی ہی نہ تھیں، جیسا کہ خود اسی حدیث میں ان کا اپنا بیان ہے:

فمشيت حتى جاوزت الجيش ''میں چلی حتی کہ میں نے لشکر کو عبور لیا۔''

نیز خود منکرِ حدیث صاحب نے بھی لکھا ہے: ''قضائے حاجت کے لیے پڑاؤ سے زیادہ دور تو آپ گئی نہ ہوں گی۔۔۔'' («صحیح بخاری کا مطالعہ»: ۱۴۹/۱)

جب دور نہ گئی تھیں تو اعتراض کس بات پر؟ اتنی سی بات منکرینِ حدیث کی عقلِ نارسا میں نہیں آسکی اور انہوں نے امام بخاری سمیت تمام علمائے امت کو مطعون کرنا شروع کر دیا ہے۔

اعتراض نمبر ③ : ''کتنی ہی لاغر و نحیف اور دھان پان سہی، بہر حال ام المؤمنین کوئی سوئیں تاگا نہ تھیں کہ کسی کو ان کے باہر جانے کا علم ہی نہ ہوتا، جب کہ کوچ کا وقت قریب تھا اور پورا لشکر کوچ کے لیے جاگا ہوا تھا اور حضور ﷺ کی قیام گاہ لشکر کے قلب و وسط میں ہوتی تھی، پس یہ کیسے ممکن ہے کہ قلبِ لشکر میں لگے ہوئے خیمہ سے کوئی عورت نکل کر جنگل کی طرف جائے اور سب کے جاگنے کے باوجود کسی کو نظر نہ آئے!'' («صحیح بخاری کا مطالعہ»: ۱۴۹/۱)

جواب: ① رات کے وقت پاس سے گزرنے والے کا علم دوسروں کو نہ ہونا عقلِ سقیم کے خلاف تو ہو سکتا ہے، عقلِ سلیم کے نہیں، خصوصاً جب کہ رات چاندنی نہ ہو اور ہر طرف اندھیرا ہو؟ جن مؤرخین نے اس غزوے کے حوالے سے ماہِ شعبان کے ساتھ ساتھ دن یا تاریخ کا ذکر کیا ہے، انہوں نے یہی لکھا ہے کہ اس غزوے سے آپ کی واپسی اس وقت ہوئی جب ماہِ شعبان کے اختتام میں صرف دو دن باقی تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رات بھی اندھیری تھی، پھر اگر کسی نے نہیں دیکھا تو کونسا عجوبہ ہے؟

④ اگر کسی نے دیکھا بھی تھا تو اس کے خیال میں آپ رضی اللہ عنہا واپس آ گئی تھیں، کیونکہ دیر تو آپ کو ہار کے

گم ہونے کی وجہ سے ہوئی تھی، کسی کو یہ علم غیب تو تھا نہیں کہ آپ کا ہار گم ہو گیا ہے اور وہ اسے تلاش کر رہی ہیں!

اعتراض نمبر ④ : ''قضائے حاجت کے لیے پڑاؤ سے زیادہ دور تو آپ گئی نہ ہوں گی، جب لشکر نے کوچ کیا ہوگا، اونٹ بلبلائے ہوں گے، لوگ باہم بول چال رہے ہوں گے اور رات کے سناٹے میں ان کے کوچ کرنے کی آواز تو دور دور تک پہنچی ہوگی، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ام المؤمنین کو اس کا پتہ نہ چلا ہو کہ اب لشکر کوچ کر رہا ہے۔۔۔واللہ یہ بالکل عقل سے خارج بات ہے کہ ام المؤمنین کو لشکر کی روانگی کا پتہ نہ چلے اور وہ ہار تلاش کرتی رہیں اور لشکر کوچ کر جائے۔۔۔'' («صحیح بخاری کا مطالعہ»: ۱/۱۴۹)

جواب : قارئین کرام! جس بے عقل کی ''عقل'' میں قرآنِ کریم میں موجود فرمانِ باری تعالیٰ لو نعلم نہ آئے اور وہ اسے عربیّت کے لحاظ سے غلط قرار دے کر اپنی بے علمی اور بے عقلی کا پورا پورا ثبوت خود دے دے، اس کی عقل سے اگر یہ حدیث خارج ہو جائے تو کوئی تعجب خیز بات نہیں، حالانکہ عام تجربے کی بات ہے کہ اچانک پیش آنے والی کسی عام پریشانی میں بھی انسان کو ساتھ بیٹھے انسان کی وہ بات نہیں سنتی جو خاص اسی سے کی جا رہی ہو، پھر نہایت بیش قیمت ہار اچانک گم ہو جانے کے بعد دور سے آنے والی عام آواز نہ سننے پر اعتراض کرنا بہت بڑی حماقت ہی ہو سکتی ہے!

اعتراض نمبر ⑤ : ''نمازِ فجر سے پہلے کوچ ہوا، راستہ میں آپ یقیناً نمازِ فجر کے لیے رکے ہوں گے، پورا لشکر رکا ہوگا، اگر ام المؤمنین رہ گئی ہوتیں تو کیا اس وقت حضورِ اکرم ﷺ کو ان کی گم شدگی کا علم نہ ہو جاتا؟ سخت حیرت کی بات ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کو نہ راستے میں اس کا علم ہو، نہ نمازِ فجر پڑھنے کے لیے اترنے پر پتہ چلے، نہ بعدِ نماز روانہ ہو جانے کے بعد تمام راستہ اس کا احساس ہو۔۔۔
اگر کوئی کہے کہ یہ ممکن ہے تو پھر محال و ناممکن بے معنیٰ بات ہے، تب تو دو اور دو کا پانچ ہونا اور دو نقیضوں کا جمع ہو جانا بھی ممکن ہوگا۔'' («صحیح بخاری کا مطالعہ»: ۱/۱۴۹۔۱۵۰)

جواب : سخت حیرت کی بات ہے کہ منکرینِ حدیث کی عقل میں اتنی بات بھی نہیں آئی، اگر ان کی عقل کبھی ٹھکانے ہو تو کوئی ان کو بتائے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے نماز یا تو اپنے خیمے میں پڑھی ہوگی یا پھر عورتوں کی صف میں جو سب سے آخر میں ہوتی ہے، وہاں ادا کی ہوگی، کیونکہ حدیثِ رسول ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلّى الله عليه وسلّم: خير صفوف

الرّجال أوّلها وشرّها آخرها ، وخير صفوف النّساء آخرها وشرّها أوّلها .

''سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مردوں کی صفوں میں سے بہترین صف سب سے پہلی اور سب سے بری (ثواب میں کم) سب سے آخری صف ہے، جبکہ عورتوں کی صفوں میں سب سے بہترین صف آخری اور سب سے بری (ثواب میں کم) پہلی صف ہے۔'' (صحيح مسلم : ٤٤٠)

نیز حدیثِ نبوی ہے: عن أمّ سلمة رضى اللّٰه عنها قالت : كان يسلّم فينصرف النّساء ، فيدخلن بيوتهن من قبل أن ينصرف رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم . ''سیدہ امّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے سلام پھیرتے تو عورتیں فوراً واپس جا کر (مقتدیوں کی طرف) آپ کے چہرۂ مبارک پھیرنے سے پہلے اپنے گھروں میں داخل ہو جاتیں۔'' (صحيح بخاری : ٨٥٠)

لہٰذا جس طرح حدیثِ نبوی میں طریقہ موجود ہے، اسی طرح فوراً نماز ختم ہوتے ہی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اٹھ کر اپنی سواری کے اوپر پڑے ہودج میں داخل ہو گئی ہوں گی۔

مزید برآں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز اندھیرے میں ادا فرماتے تھے، جیسا کہ:

عن عائشة رضى اللّٰه عنها قالت : ان كان رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم ليصلّى الصّبح ، فينصرف النّساء متلفّعات بمروطهن ، ما يعرفن من الغلس .

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، بیان کرتی ہیں کہ اس بات میں کچھ شبہ نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز ادا فرماتے تو عورتیں فوراً چادروں میں لپٹی ہوئی واپس چلی جاتیں، وہ اندھیرے کی وجہ سے پہچانی نہ جاتی تھیں۔'' (صحيح بخاری : ٨٦٧، صحيح مسلم : ٦٤٥)

لہٰذا اس حدیث میں بیان کیے گئے معمول کے مطابق یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ فجر اندھیرے میں ادا کی گئی ہو گی، اس لیے یہ خیال نہ فرمایا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کیوں نظر نہیں آئیں۔

اتنی سی سمجھ بھی منکرینِ حدیث کو نصیب نہیں ہوئی، پھر بھی وہ اعتراض کرتے ہیں امام بخاری رحمہ اللہ پر جو کہ بالاتفاق امیر المؤمنین فی الحدیث ہیں۔ اس پر اعتراض کرنا اڑھائی + اڑھائی کے پانچ ہونے پر اعتراض کرنے کے مترادف ہے۔

اعتراض نمبر ⑥ : ''بالفرض حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات کو نمازِ فجر

کے لیے اترنے پر بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گم شدگی کا علم نہ ہوا اور راستے میں بھی پتہ نہ چل سکا اور مان لیجیے کہ اگلی منزل پر پڑاؤ کرنے کے بعد بھی علم نہ ہوا اور اب بھری دوپہر میں صفوان انہیں اپنے اونٹ پر سوار کیے ہوئے لائے۔۔۔تو کیا یہ بات ایسی تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پیچھے رہ جانے کی وجہ دریافت نہ فرماتے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جو بہت سریع الغضب تھے، یعنی انہیں ناگوار بات پر جلد غصہ آجاتا تھا، اپنی بیٹی پر ناراض نہ ہوتے، لیکن نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کچھ پوچھا نہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کچھ کہا، جیسا کہ زہری کی بیان کردہ داستان سے مفہوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس سلسلے میں کوئی پوچھ گچھ نہیں کی گئی، ان وجوہ سے روزِ روشن کی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ یہ داستان شروع سے آخر تک قطعاً غلط ہے۔۔۔۔''

(«صحیح بخاری کا مطالعہ» : ۱/۱۵۰۔۱۵۱)

جواب : قارئین! آپ پوری حدیثِ افک پڑھ جائیں، آپ کو صراحتاً یا اشارۃً، کسی طریقے سے بھی یہ معلوم نہیں ہوگا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس بارے میں کچھ بھی نہیں پوچھا گیا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس بارے میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ضرور کوئی پوچھ گچھ ہوئی ہوگی اور ان کے عذر کو سن کر ڈانٹ ڈپٹ نہ کی گئی ہوگی، نیز منافقین نے جو سارا پروپیگنڈا کیا، اس کا اظہار فوراً نہیں ہوا، نہ اس کی خبر اسی وقت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ تک پہنچی تھی کہ وہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے برہم ہوتے، مزید برآں تیمّم کی مشروعیت والی حدیث میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہار کے گم ہوجانے کی وجہ سے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ جو برہم ہوئے تھے، اس کے بعد آیاتِ تیمّم نازل ہوگئیں تو سیدنا اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: ما هي بأوّل بركتكم يا آل أبي بكر .

''اے ابوبکر کی اولاد! یہ تمہاری پہلی برکت تو نہیں ہے۔'' (صحیح بخاری : ۳۳۷، صحیح مسلم : ۳۶۷)

لہٰذا اس وقت سے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ معلوم کر چکے تھے کہ میری بیٹی عائشہ رضی اللہ عنہا سے اگر کوئی ایسا کام سرزد ہوتا ہے جو بظاہر ناگوار محسوس ہوتا ہو تو اس میں بھی کوئی خیر و بھلائی ہی مضمر ہوتی ہے، اس لیے وہ اب برہم نہ ہوئے۔

❀❀❀❀❀❀❀

جاری ہے۔۔۔
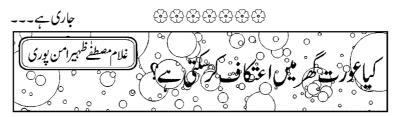
عورت گھر میں اعتکاف نہیں کر سکتی، کیونکہ اعتکاف کی شرعی تعریف یہ ہے: المكث في المسجد

من شخص مخصوص بصفة مخصوصة . ''کسی مخصوص شخص کا خاص صفت کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنے کا نام اعتکاف ہے۔'' (شرح مسلم للنووی: ۳۷۷/۱، فتح الباری لابن حجر: ۲۷۱/٤، فتاویٰ عالمگیری: ۲۲۱/۱)

امام بریلویت احمد یار خان بریلوی (۱۳۲۴۔۱۳۹۱) لکھتے ہیں: ''اعتکاف کا معنیٰ ہیں، عبادت کی نیت سے مسجد میں ٹھہرنا۔'' (تفسیر نور العرفان: ٤٤، نیز دیکھیں: علم الفقه از عبد الشکور دیوبندی: ٤٥٩/۳)

حافظ نووی رحمہ اللہ (٦۳۱۔٦٧٦ھ) لکھتے ہیں: وفی هذه الأحادیث أن الاعتکاف لا یصحّ الّا فی المسجد ، لأنّ النّبیّ صلی الله علیه وسلم وأزواجه وأصحابه انّما اعتکفوا فی المسجد مع المشقّة فی ملازمته ، فلو جاز فی البیوت لفعلوه ولو مرّة ، لا سیّما النّساء ، لأنّ حاجتهنّ الیه فی البیوت أکثر ، وهذا الّذی ذکرناه من اختصاصه بالمسجد ، وأنّه لا یصحّ فی غیره ، هو مذهب مالک والشّافعیّ وأحمد وداوٗد والجمهور ، سواء الرّجل والمرأة .

''ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اعتکاف صرف مسجد میں جائز ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کی ازواج اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم، نے مشقت کے باوجود مسجد میں ہی اعتکاف کیا، اگر گھر میں جائز ہوتا تو آپ ایک مرتبہ (بیانِ جواز کے لیے) ہی ایسا کرتے، خصوصاً جب کہ آپ کی ازواج کے لیے گھر میں اعتکاف کی زیادہ ضرورت تھی، مرد اور عورت دونوں کے لیے صرف مسجد میں اعتکاف کے جواز اور مسجد کے علاوہ عدمِ جواز کا جو مؤقف ہم نے بیان کیا ہے، یہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، داؤد اور جمہور محدثین رحمہم اللہ کا ہے۔''

(شرح مسلم للنووی: ۳۷۷/۱)

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ (۷۷۳۔۸۵۲ھ) آیتِ مبارکہ ﴿وَاَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِيْ الْمَسَاجِدِ﴾ کے تحت لکھتے ہیں: فعلم من ذکر المساجد أنّ المراد أنّ الاعتکاف لا یکون الّا فیها . ''اس آیت میں مسجدوں کے ذکر سے معلوم ہوا کہ مسجد کے علاوہ اعتکاف ہوتا ہی نہیں۔'' (فتح الباری: ۲۷۲/٤)

احناف کے ''ابوحنیفہ ثانی'' ابنِ نجیم حنفی لکھتے ہیں: انّ کلّ حکم ثبت للرّجال ثبت للنّساء ، لأنّهنّ شقائق الرّجال ، الّا ما نصّ علیه .

''ہر وہ حکم جو مردوں کے لیے ثابت ہو، وہ عورتوں کے لیے بھی ثابت ہوتا ہے، کیونکہ عورتیں مردوں کی نظائر ہیں، سوائے اس حکم کے جس پر (خاص) نص وارد ہو جائے۔'' (البحر الرائق لابن نجیم الحنفی: ٤۳/۱)

جناب جسٹس تقی عثمانی دیوبندی کہتے ہیں: ''عورتیں تمام احکام میں مردوں کے تابع ہوتی ہیں۔'' (درس ترمذی از تقی: ۳۲۸/۳)

جب مرد کا اعتکاف مسجد کے علاوہ کہیں جائز نہیں تو عورت کے لیے بغیر دلیل کے جائز کیوں؟ پھر سب کے نزدیک مسجد میں ٹھہرنا اعتکاف کا رکن بھی ہے۔

دیکھیں (الهداية مع البناية : ۴۰۷/۳، ابن عابدين : ۴۴۱/۲، بلغة السالك : ۵۳۸/۱، كشاف القناع : ۳۴۷/۲)

جب اعتکاف مسجد کے ساتھ خاص ہے اور مسجد میں ٹھہرنا اعتکاف کا رکن ہے تو پھر بغیر دلیل کے عورت سے یہ ''خصوصیت'' اور ''رکنیت'' کیسے ساقط ہوگئی؟

نبی کریم ﷺ کے زمانۂ اقدس میں اور آپ ﷺ کے بعد آپ کی ازواجِ مطہرات مسجد میں ہی اعتکاف کیا کرتی تھیں، اگر عورت کے لیے گھر میں اعتکاف کرنا صحیح ہوتا تو وہ اپنے گھروں میں اعتکاف کرتیں، علاوہ ازیں عورت کو گھر میں رہنے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، مگر اس کے باوجود مسجد میں اعتکاف کرتی تھیں، کسی صحابی سے اس پر انکار ثابت نہیں، گویا کہ عورت کے مسجد میں اعتکاف کے جواز پر صحابہ کرام کا اجماع تھا۔

ابنِ ہبیرہ (م۵۶۰ھ) لکھتے ہیں: **وأجمعوا على أنّه لا يصحّ اعتكاف المرأة في بيتها، الّا أبا حنيفة قال: يجوز اعتكافها في مسجد بيتها.**

''اس بات پر (مسلمانوں کا) اجماع و اتفاق ہے کہ عورت کا اعتکاف گھر میں صحیح نہیں، لیکن ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ اس کے لیے اپنے گھر کی نماز والی جگہ میں اعتکاف جائز ہے۔'' (الافصاح لابن هبيرة : ۲۵۶/۱)

اجماع کے شریعت کی معصوم دلیل ہونے پر بھی اجماع ہے، اس کی مخالفت کرنے والے کون لوگ ہوسکتے ہیں؟

برِصغیر پاک و ہند کے محقق حنفی عالم علامہ عبدالحیٔ لکھنوی حنفی (۱۲۶۴۔۱۳۰۴ھ) لکھتے ہیں:

لو اعتكفت في مسجد جماعة في خباء ضرب لها فيه، لا بأس به، لثبوت ذالک عن أزواج النّبيّ صلى الله عليه وسلم في عهده كما ثبت في صحيح البخاريّ.

''اگر عورت ایسی مسجد میں جس میں نماز باجماعت ہوتی ہو اور اس کے لیے خیمہ لگایا گیا ہو، اعتکاف کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ اس کا ثبوت عہدِ نبوی میں نبی کریم ﷺ کی بیویوں سے ملتا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری سے ثابت ہے۔'' (عمدة الرعاية : ۲۵۵/۱)

حافظ ابنِ قدامہ المقدسی رحمہ اللہ (م۶۲۰ھ) لکھتے ہیں: ''ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿وَاَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِيْ الْمَسَاجِد﴾ ہے، اس سے مراد وہ جگہیں ہیں جو نماز کے لیے بنائی گئی ہیں، عورت کی گھر میں نماز کی جگہ وہ مسجد نہیں ہے، اس لیے کہ وہ نماز کے لیے نہیں بنائی گئی، اگرچہ مجازی طور پر اس کا نام مسجد رکھا گیا ہے،

اس جگہ کے لیے حقیقی مسجد کے احکام ثابت نہیں ہوتے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ((جعلت لی الأرض مسجداً)) (میرے لیے ساری زمین مسجد بنادی گئی ہے) ہے، اس لیے نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات نے آپ ﷺ سے مسجد نبوی میں اعتکاف کرنے کی اجازت چاہی تو آپ نے ان کو اجازت دے دی، اگر مسجد ان کے لیے اعتکاف کی جگہ نہیں تھی تو آپ نے ان کو اجازت کیوں دی؟ اگر مسجد کے علاوہ کہیں اور اعتکاف کرنا افضل ہوتا تو آپ ان کو اس جگہ کی طرف رہنمائی دیتے، لہٰذا (عورت کا گھر میں اعتکاف نہیں ہوسکتا)، چونکہ اعتکاف قربت کا نام ہے، اس قربت کا حصول مرد کے حق میں مسجد کے ساتھ مشروع کیا گیا ہے، پس عورت کے حق میں بھی مشروع کردیا گیا ہے، جس طرح کہ طواف ہے۔'' (المغنی لابن قدامة : ۱۹۰/۳)

گھر کی مسجد نہ حقیقی مسجد ہوتی ہے، نہ ہی حکمی، کیونکہ مسجد میں خرید وفروخت حرام ہوتی ہے، گھر کی مسجد میں خرید وفروخت ہوسکتی ہے، گھر کی مسجد کو تبدیل کیا جاسکتا ہے، جب کہ حقیقی مسجد کو بلاضرورت تبدیل نہیں کیا جاسکتا، مسجد میں جنبی انسان یا حائضہ عورت کا سونا منع ہے، جبکہ گھر کی مسجد میں سویا جاسکتا ہے، مسجد میں شوروغل اور کھیل کود منع ہے، جبکہ گھر کی مسجد میں کوئی حرج نہیں۔

صحیح بخاری سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی بیویوں کو مسجد میں اعتکاف کی اجازت دی، ایک دوسری روایت میں آپ ﷺ سے انکار بھی ثابت ہے، وہ کسی عارضہ کے پیشِ نظر تھا، ہوسکتا ہے کہ ازواجِ مطہرات کے کثرت سے مسجد میں خیمے لگانے سے مسجد تنگ ہوجانے کا خدشہ ہو۔

جب آپ ﷺ نے انکار کیا تب بھی آپ نے ان کو گھر میں اعتکاف کرنے کا حکم نہیں دیا، اگر عورت کا مسجد میں اعتکاف کرنا صحیح نہیں تو قبل ازیں عورتوں کو اجازت کیوں دی تھی؟ جبکہ آپ ﷺ کے دور کے بعد بھی عورتیں مسجد میں ہی اعتکاف کیا کرتی تھیں، لہٰذا ثابت ہوا کہ عورت قطعی طور پر گھر میں اعتکاف نہیں کرسکتی۔

علاوہ ازیں گھر کی مسجد میں عورت کے اعتکاف کو اس کی نماز پر قیاس کرنا کہ جس طرح عورت کی نماز گھر میں افضل ہے، اسی طرح اعتکاف بھی افضل ہے، یہ قیاس باطل ہے، کیونکہ ازواجِ مطہرات کا مسجد میں اعتکاف کرنا نص سے ثابت ہے، نص کے مقابلے میں قیاس غیر مقبول اور باطل ہوتا ہے۔ (الهداية مع البناية : ۴۰۸/۳، عمدة القاری فی شرح صحيح البخاری : ۱۶۴/۶، ۲۳۳، ۲۳۴، ۱۲۰/۱۳، السعاية از عبد الحی الکنوی الحنفی : ۲۰۹/۱، الافاضات اليومية از اشرف علی تھانوی دیوبندی : ۳۰۵/۱، خزائن السنن از سرفراز خان صفدر دیوبندی حیاتی : ۱۹۸/۱، روحوں کی دنیا از احمد رضا خان بریلوی : ۲۸۸ وغيرهم)

امامِ بریلویت احمد یار خان نعیمی بریلوی لکھتے ہیں: ''نص کے مقابل قیاس کرنا شیطان کا کام

ہے، باعثِ لعنت اور گمراہی ہے۔'' (تفسیر نور العرفان از نعیمی : ٢٣٤، ٢٤٠، ٣٣٨، ٧٣٠، ٨٤١)

مزید لکھتے ہیں: ''نص کے مقابلے میں قیاس دوڑانا جائز نہیں۔'' («جاء الحق» : ٢٣٠/٢)

امام عینی حنفی ایک دوسری جگہ عجیب بات لکھتے ہیں: **اذا تعارض القیاسان وجب المصیر الی النّص.**

''جب دو قیاس متعارض ہو جائیں تو اس وقت نص کی طرف جانا واجب ہو جاتا ہے۔'' (البنایة : ٩١/٤)

جب نص کی موجودگی میں قیاس جائز ہی نہیں تو پہلے قیاس، پھر نص کی طرف جانے کا کیا معنیٰ ؟

اگر گھر کی مسجد میں عورت کے لیے اعتکاف کرنا جائز ہوتا تو آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات ضرور بالضرور گھر میں اعتکاف کرتیں، پھر اعتکاف کا قیاس نماز کے ساتھ صحیح نہیں ہے، کیونکہ مرد کی سنتیں اور دوسری نفلی نماز گھر میں افضل ہے، اعتکاف جو کہ سنت ہے، وہ اس کے لیے گھر میں جائز نہیں ہے تو عورت کے لیے کیسے جائز ہوگا ؟ اس کے علاوہ حنفی مذہب میں بھی عورت کو مسجد میں اعتکاف کی اجازت ہے، جیسا کہ رئیسِ احناف ابنِ ہمام حنفی لکھتے ہیں: **ولو اعتکفت فی الجامع أو فی مسجد حیّھا ، وھو أفضل من الجامع فی حقّھا جاز .** ''اگر عورت جامع مسجد میں یا اپنے قبیلے کی مسجد میں اعتکاف کرے تو جائز ہے، ہاں اس کے قبیلہ کی مسجد اس کے حق میں (قریب ہونے کی وجہ سے) جامع مسجد سے زیادہ بہتر ہے۔''

(فتح القدیر شرح الهدایة : ٣٩٤/٢ ، شرح النقایة از ملا علی القاری الحنفی : ٤٣٥/١)

امام ابوحنیفہ سے باسندِ صحیح عورت کے گھر میں اعتکاف کرنے کا جواز ثابت نہیں، حسن بن زیاد (متھم بالکذب) نے امام صاحب سے عورت کے لیے محلّہ کی مسجد میں اعتکاف کا جواز نقل کیا ہے۔

(بدائع الصنائع از کاسانی حنفی : ١١١/٢)

ثابت ہوا کہ ائمہ کے نزدیک عورت کا مسجد میں اعتکاف کرنا جائز نہیں۔

الحاصل : اگر عورت سمجھتی ہے کہ وہ مسجد میں محفوظ و مأمون ہے تو خاوند کی اجازت سے مسجد میں اعتکاف کرے، ورنہ ترک کر دے۔

سورۂ حج میں دو سجدے ہیں

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

سورۂ حج میں دو سجدے ہیں، جیسا کہ سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی، کیا سورۂ حج میں دو سجدے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا، ہاں، سورۂ حج میں دو سجدے ہیں، جس نے یہ دو سجدے نہ کیے، اس نے ان دونوں کو نہیں پڑھا۔

(سنن ابی داؤد : ١٤٠٢، سنن الترمذی : ٥٧٨، مسند الامام احمد : ١٥١/٤، ١٥٥، وسندهٗ حسن)

ثعلبہ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ نماز پڑھی، آپ نے سورۂ حج کی قراءت کی، اس میں دو سجدے کیے۔(مصنف ابن ابی شیبۃ : ۱۱/۲، شرح معانی الآثار للطحاوی : ۳۶۲/۱، وسندہٗ صحیح)

عبداللہ بن دینار رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا، آپ نے سورۂ حج میں دو سجدے کیے۔

(مؤطا امام مالک : ۲۰۶/۱، وسندہٗ صحیح)

ابوالعالیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، سورۂ حج میں دو سجدے ہیں۔(السنن الکبریٰ للبیہقی : ۳۱۸/۲، وسندہٗ صحیح)

جبیر بن نفیر کہتے ہیں کہ سیدنا ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے سورۂ حج میں دو سجدے کیے۔(مصنف ابن ابی شیبۃ : ۱۱/۲، وسندہٗ صحیح)

سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے سورۂ حج کے آخری سجدہ کی تلاوت کی اور منبر سے اتر کر سجدہ کیا۔(مصنف ابن ابی شیبۃ : ۱۸/۲، وسندہٗ صحیح)

امام ابوالعالیہ رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں: ''سورۂ حج میں دو مبارک اور طیب سجدے ہیں۔''(مصنف ابن ابی شیبۃ : ۱۱/۲۔۱۲، وسندہٗ صحیح)

زر بن حُبَیش اور ابوعبدالرحمٰن السلمی سورۂ حج میں دو سجدے کرتے تھے۔(مصنف ابن ابی شیبۃ : ۱۲/۲، وسندہٗ صحیح)

امام عمرو بن عبداللہ ابواسحاق السبیعی تابعی رحمہ اللہ (م ۱۲۷ھ) کہتے ہیں: ''میں ستر سال سے لوگوں کو سورۂ حج میں دو سجدے کرتے دیکھ رہا ہوں۔''(مصنف ابن ابی شیبۃ : ۱۲/۲، وسندہٗ صحیح کالشمس وضوحاً)

امام شافعی(الام : ۱۳۸/۱)، امام احمد بن حنبل(مسائل احمد واسحاق : ۹۱/۱)، امام اسحاق بن راہویہ(جامع ترمذی تحت حدیث : ۵۷۸)، امام عبداللہ بن مبارک(جامع ترمذی تحت حدیث : ۵۷۸)، امام ابن المنذر(الاوسط لابن المنذر : ۲۶۷/۵) رحمہم اللہ سورۂ حج میں دو سجدوں کے قائل ہیں۔

فائدہ نمبر ①: سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ سورۂ حج میں ایک سجدہ ہے۔(مصنف ابن ابی شیبۃ : ۱۲/۲)

اس کی سند میں ہشیم بن بشیر کی ''تدلیس'' ہے، لہٰذا روایت ''ضعیف'' ہے، نیز ان کے اپنے فتویٰ کے خلاف بھی ہے۔

فائدہ نمبر ②: سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ سورۂ حج میں پہلا سجدہ عزیمت (پختگی) کے لیے اور دوسرا برائے تعلیم ہے، آپ سورۂ حج میں سجدہ نہیں کرتے تھے۔(شرح معانی الآثار للطحاوی : ۳۶۲/۱)

اس کی سند ''ضعیف'' ہے، اس میں عبدالاعلیٰ بن عامر الثعلبی راوی جمہور کے نزدیک ''ضعیف'' ہے۔

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''امام ابوزرعہ الرازی اور امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے اسے ''ضعیف'' کہا ہے، جمہور کے نزدیک ''قوی'' نہیں ہے۔(فتح الباری لابن حجر : ۱۲۴/۱۲۔۱۲۵)

فائدہ نمبر ③: سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سورۂ حج میں ایک سجدہ ہے۔(مصنف ابن ابی شیبۃ : ۱۲/۲، وسندہٗ صحیح)

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا قول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان، صحابہ کے اقوال و افعال اور سلف صالحین کے قول و عمل کے خلاف ہونے کی وجہ سے نا قابل عمل اور نا قابل التفات ہے۔

❀❀❀❀❀❀❀